سانحۂ کربلا

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی
عزیمت وعظمت کی صحیح تصویر

شہیدِ مظلوم رضؓ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے
مناقب اور آپ کی مظلومانہ
شہادت کے بیان پر جامع تالیف

- یہود نے عہد صدیقیؓ میں جس سازش کا بیج بویا تھا' آتش پرستانِ فارس کے جوشِ انتقام نے اسے تناور درخت بنا دیا تھا۔
- وہ آج بھی قاتلِ خلیفۂ ثانیؓ ابولولو فیروز مجوسی کی قبر کو متبرک سمجھتے ہیں۔
- علی مرتضیٰؓ کی طرح حضرت حسینؓ بھی قاتلینِ عثمانؓ کی سازش کا شکار ہوئے۔
- سید الشہداء کون ہیں اور شہیدِ مظلوم کون؟ تاریخی حقائق کو سمجھنے کے لئے

بانی تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی دو جامع اور مختصر مگر عام فہم اور محققانہ تاریخی کتابوں
کا مطالعہ کیجئے

دونوں کتابوں کے سیٹ کی مجموعی قیمت
اشاعت خاص: 38 روپے' اشاعت عام: 22 روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن
36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 03-5869501

نمبر 3-3-04
۳۶ ۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد

مدیر منتظم: حافظ عاکف سعید

نائب مدیر: حافظ خالد محمود خضر

ادارہ تحریر:

پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی ۔ پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

جلد ۲۳ محرم الحرام ۱۴۲۵ھ - مارچ ۲۰۰۴ء شمارہ ۳

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ ۔ کے ۔ ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور ۱۴ ۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

سالانہ زرِ تعاون: 100 روپے' فی شمارہ: 10 روپے

ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ: 700 روپے امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ: 900 روپے

حرفِ اول

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دجالی تہذیب کا استیلاء اور ہمارا امتحان!

مذہب اور خدا سے دوری کے باعث آج کا انسان انسانیت کی سطح سے مستعفی ہو کر حیوان کی سطح پر آ چکا ہے۔ چنانچہ آج وہ اپنے لئے معاشرتی اقدار بھی جانوروں سے اخذ کر رہا ہے۔ یہ ابلیس کی سب سے بڑی کامیابی ہے جو روزِ اوّل سے انسان کو شرفِ انسانیت سے محروم کرنے کے درپے ہے۔ امریکہ آج جس تہذیب کو پوری دنیا پر مسلط کرنا چاہتا ہے' وہ دجالی تہذیب ہے۔ اس تہذیب کو ابلیس اور اس کے ایجنٹ یہود نے متعارف کرایا ہے' کیونکہ ابلیس کی طرح یہود بھی چاہتے ہیں کہ ان کے علاوہ باقی انسانیت کو بے حیائی اور آوارگی میں مبتلا کر کے حیوان بنا دیا جائے اور انہیں اپنا معاشی غلام بنا کر پوری دنیا پر معاشی حکمرانی کی جائے۔

یورپ نے جو سائنسی ترقی کی ہے وہ قرآن و مذہب سے متصادم نہیں' کیونکہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور کائنات اللہ کا فعل ہے' جبکہ سائنس کائناتی حقائق کی دریافت کے علم ہی کا نام ہے' چنانچہ ان دونوں میں تضاد ممکن نہیں۔ آج کے انسان کی مذہب سے دوری کا سبب ابلیت مسیح کے بے سروپا عقیدے پر مشتمل پاپائیت کا وہ نظام ہے جسے مذہب کے نام پر یورپ میں مسلط رکھا گیا۔ لیکن اہل یورپ نے جب سپین کی اسلامی یونیورسٹیوں سے علم حاصل کیا تو انہوں نے نام نہاد پاپائیت کے خلاف بغاوت کر دی۔ تاہم اس کے بعد وہاں جو تہذیب پروان چڑھی اس کے رگ و ریشے میں مذہب سے دشمنی اور نفرت رچ بس گئی۔ گویا وہ یک چشمی تہذیب ہے جس نے اللہ اور مذہب کی طرف سے ایک آنکھ بند کر رکھی ہے۔ آسمانی رہنمائی سے اعراض ہی کا نتیجہ ہے کہ آج انسانی سوچ زمینی حقائق اور دنیا کے اسباب میں الجھ کر رہ گئی ہے اور مسبب الاسباب اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ یہی دجالیت ہے۔ چنانچہ آج ہمارا امتحان یہ ہے کہ کون مادّی وسائل و ذرائع پر بھروسہ کرتا ہے اور کس کا توکل و بھروسہ اللہ کی ذات پر ہے۔ احادیثِ نبویہؐ کی رو سے قیامت سے قبل حق و باطل کا ایک بہت بڑا معرکہ ہو گا جس کے آغاز میں اگرچہ اہل حق کو بہت نقصان اٹھانا پڑے گا لیکن بالآخر فتح ان اہل ایمان ہی کو حاصل ہو گی جو اللہ پر توکل و بھروسہ اور اس کے فاعل حقیقی ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ oo

مطالعہ قرآن حکیم

منتخب نصاب (درس ۲۶)

ڈاکٹر اسرار احمد

اُمت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں
قرآنِ حکیم کی جامع ترین سورت
اُمُّ المُسَبِّحات : سورۃ الحدید
(۱۱)

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم ..... امّا بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم۔ بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

﴿ اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۞ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۞ اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ۞ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ؕ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ۞ ﴾ (آیات ۱۶ تا ۱۹)

سورۃ الحدید کا چوتھا حصہ ہمارے زیر مطالعہ ہے' جو چار آیات (۱۶ تا ۱۹) پر مشتمل ہے۔ اس کی پہلی تین آیات (۱۶ تا ۱۸) پر ہماری گفتگو ماقبل درس میں تقریباً مکمل ہو چکی ہے۔ اس حصہ کی چوتھی اور آخری آیت (آیت ۱۹) اس سورۂ مبارکہ کی عظیم ترین آیات میں سے ہے۔ بعض اعتبارات سے اس کے جو اصل مفاہیم ہیں اور اس کی جو اصل عظمت ہے' واقعہ یہ ہے کہ اس کی طرف بہت کم توجہ ہوئی ہے۔ اس کے کچھ اسباب ہیں جو بعد میں بیان ہوں گے۔ اس آیۂ مبارکہ پر غور کرنے سے پہلے ان چاروں آیات کی ترجمانی کر لی جائے!

سلوکِ قرآنی۔ منزل بمنزل

ارشاد ہوا: ﴿ اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ ﴾ ''کیا ابھی وقت نہیں آیا ہے اہل ایمان کے لئے (ایمان کے دعوے داروں کے لئے) کہ ان کے دل واقعتاً جھک جائیں اللہ کی یاد کے لئے اور (وہ تسلیم کر لیں اس سب کو) جو حق میں سے نازل ہوا ہے''۔ یہ جھک جانا قبولیت کے لئے ہے اور اس میں تواضع بھی ہے۔ یعنی اہل ایمان اللہ کی یاد میں جھک جائیں اور جو کچھ حق میں سے نازل ہوا ہے' یعنی قرآن حکیم' اس کو قبول کریں جیسے کہ قبول کرنے کا حق ہے' اسے تسلیم کریں جیسے کہ تسلیم کرنے کا حق ہے۔ ﴿وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ ﴾ ''اور نہ ہو جائیں ان لوگوں کے مانند جنہیں کتاب دی گئی تھی پہلے'' ﴿ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ ﴾ ''تو اُن پر ایک طویل مدت گزر گئی'' ﴿ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ ﴾ ''تو اُن کے دل سخت ہو گئے'' ﴿ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ ﴾ ''چنانچہ اب ان میں سے بہت سے فاسق و فاجر ہیں''۔

﴿ اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ ﴾ ''جان رکھو! کہ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے مُردہ ہونے کے بعد از سر نو زندگی عطا فرما دیتا ہے''۔ یعنی اگر تم بھی اپنے دلوں میں جھانکو اور محسوس کرو کہ دل میں سختی ہے' دل میں ایمان کا نور نہیں ہے' ایمان کی فصل نہیں لہلہا رہی ہے تو مایوس نہ ہو۔ ﴿ قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ

تَعْقِلُوْنَ ﴾ ''ہم نے تو تمہارے لئے اپنی آیات کو واضح کر دیا ہے (تمہاری سبق آموزی کے لئے ہم نے اپنی آیات کو نمایاں کر دیا ہے) تاکہ تم عقل سے کام لو (غور کرو، سمجھو)''۔ لیکن اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے دلوں کی کشتِ ویراں میں بھی ایمان کی بہار دوبارہ آئے تو کچھ محنت اور مشقت کرنی ہوگی، ہل چلانا ہوگا۔ وہ ہل کیا ہے؟

﴿ اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ ﴾ ''یقیناً کثرت کے ساتھ صدقہ وخیرات کرنے والے مَرد اور کثرت کے ساتھ صدقہ و خیرات کرنے والی عورتیں''۔ یہ ''مُصَّدِّقِيْنَ'' دراصل ''مُتَصَدِّقِيْنَ'' ہے۔ بابِ تفعّل میں ''ت'' ''ص'' کے ساتھ مدغم ہو جانے کی وجہ سے مُتَصَدِّقِيْنَ کی بجائے مُصَّدِّقِيْنَ اور مُتَصَدِّقٰتِ کی بجائے مُصَّدِّقٰتِ ہو گیا ہے۔ ﴿ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾ ''اور جنہوں نے قرض دیا ہو اللہ کو قرضِ حسنہ''۔ جنہوں نے نہایت عمدگی، حسن نیت اور خوبصورتی کے ساتھ اللہ کو قرض دیا ہو اور اس میں مال بھی وہ صرف کیا ہو جو محبوب ہو۔ ﴿ يُّضٰعَفُ لَهُمْ ﴾ ''ان کے لئے (جو کچھ انہوں نے دیا ہوگا) اسے بڑھایا جاتا رہے گا''۔ ﴿ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴾ ''اور (اس پر مستزاد) ان کے لئے بہت ہی باعزت اجر ہوگا''۔

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ ﴾ ''اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر وہی ہیں صدیق اور شہید اپنے ربّ کے پاس''۔ ﴿ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ۭ ﴾ ''ان کے لئے محفوظ ہے ان کا اجر بھی اور ان کا نور بھی''۔ ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴾ ''اور جنہوں نے کفر کیا اور تکذیب کی ہماری آیات کی تو وہ جہنم والے ہیں''۔

جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے، تربیت اور تعلیم کا یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ ایک طرف زجر و ملامت، سختی، تنبیہ اور تہدید ہو، لیکن ساتھ ہی حوصلہ افزائی بھی ہو، تھپکی بھی دی جائے، شاباش بھی ہو۔ دل کی اُن ہمتوں کو از سرِ نو سہارا دیا جائے جو کمزور پڑ رہی ہوں۔ ان چار آیات کے لئے میں نے ''سلوکِ قرآنی'' کا عنوان تجویز کیا ہے۔ پہلی آیت میں جھنجھوڑنے کا انداز ہے کہ کیا ہو گیا ہے؟ کیوں تاخیر و تعویق میں

پڑے ہوئے ہو؟ ایمان کا دعویٰ بھی کرتے ہو لیکن اس کے حقوق ادا کرنے کو تیار نہیں ہو! ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝﴾ ''کیوں کہتے ہو وہ جو کرتے نہیں ہو؟'' اور اس کے ساتھ ہی تہدید اور تنبیہہ بھی ہے کہ دیکھ لو! تم سے پہلے بھی ایک اُمت تھی' اور بعض اعتبارات سے تو اس کی بڑی فضیلت تھی' ان کے ہاں بیسیوں نبی مبعوث ہوئے۔ ظاہر بات ہے کہ چودہ سو برس تک اُن میں نبوت کا تار ٹوٹا ہی نہیں' تو یقیناً بیسیوں نبی آئے ہوں گے۔ بہرحال انہیں بھی کتابیں دی گئی تھیں۔ ایک کتاب کا یہاں جو خاص طور پر ذکر ہو رہا ہے وہ تورات ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ﴾ ''اور ان لوگوں کے مانند نہ ہو جائیں جنہیں کتاب دی گئی تھی پہلے''۔ اگر ''الکتاب'' میں ''ال'' کو لامِ جنس مانا جائے تو یہاں پر تین کتابیں مراد ہو سکتی ہیں' تورات' انجیل اور زبور۔ تو یہاں متنبہ کیا جا رہا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ تم بھی اسی انجام سے دوچار ہو جاؤ جس انجام سے وہ دوچار ہو چکے ہیں اور وہ نشانِ عبرت بن چکے ہیں۔

اگلی آیت میں حوصلہ افزائی ہے کہ گھبراؤ نہیں' مایوس نہ ہو جانا۔ جیسے ایک جگہ فرمایا گیا ہے: ﴿لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ﴾ (یوسف: ۸۷) ''اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہونا'' بلکہ اللہ تعالیٰ کی یہ قدرت ہے کہ وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے مُردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کی اس مُردہ کھیتی کو ایمان' عمل صالح اور انفاق فی سبیل اللہ کی فصل سے آباد کر دے گا۔ البتہ اس کے لئے تمہیں ہل چلانا ہو گا' دل سے حبّ مال کی نجاست کو نکالنا ہو گا۔ حبِّ دُنیا کے لئے علامت (Symbol) مال کی محبت ہے۔ اسے ہر دو طریقوں پر دل سے نکالنا ہو گا' محتاجوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کر کے بھی اور اللہ کے دین کے قیام کی جدوجہد کے لئے بھی۔ مَیں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں کہ یہ حبّ مال ایک طرح کا بریک ہے۔ یہ بریک کھلے گا تو گاڑی چلے گی' ورنہ ایکسیلیٹر دباتے رہو گے گاڑی حرکت نہیں کرے گی۔ اس کے لئے دونوں مدّیں بیان کر دی گئیں۔ ایک مدّ صدقہ اور خیرات ہے کہ غرباء' مساکین' یتیموں کی فلاح و بہبود کے لئے خرچ کرنا' بھوکوں کو کھانا کھلانا' جو بیمار ہیں اُن کے علاج

معالجے کی صورت پیدا کرنا' مقروضوں کا قرض ادا کرنا۔ اور دوسری مدّ ہے اللہ کے دین کے لئے قرضِ حسنہ دینا' اللہ کے دین کے غلبے کے لئے' اس کی حکومت قائم کرنے کے لئے بڑھ چڑھ کر مال صرف کرنا۔ اس سے دل کی نجاست دُور ہو جائے گی۔ اسی کا نام ''تزکیہ'' ہے۔ ''زکوٰۃ'' کا لفظ اسی مالی عبادت کے لئے اسمِ علم ہے۔ اس لئے کہ اس سے تزکیہ ہوتا ہے' اس سے دلوں کے اندر کی نجاست دھلتی ہے' اور وہی درحقیقت ایمان کے راستے میں رکاوٹ ہے۔

تزکیہ کا مفہوم ایک مثال سے سمجھئے! دیکھئے ایک باغبان نے اپنے باغ میں کچھ پودے اور درخت تو خود لگائے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ پودے یا درخت پروان چڑھیں۔ لیکن کچھ خودرو گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ اِدھر اُدھر اُگ آئی ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ یہ خودرَو نباتات (unwanted plants) ہوا میں سے آکسیجن کو بھی جذب کر رہی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو پوری کی پوری آکسیجن جو مہیا ہے وہ اس پودے اور درخت کے لئے ہوگی کہ جو باغبان چاہتا ہے کہ پروان چڑھے۔ اسی طرح زمین کے اندر جو بھی قوتِ نمو ہے اس میں سے بھی یہ کھینچ رہے ہیں' ورنہ یہ ساری قوتِ نمو اُس پودے کے لئے ہوگی جو پودا باغبان چاہتا ہے کہ پروان چڑھے۔ لہٰذا باغبان کُھر پہ ہاتھ میں لے کر اِن سب کو صاف کر کے پھینک دیتا ہے' تاکہ اصل پودا یا درخت بڑھے اور پروان چڑھے۔ یہ تزکیہ ہے۔ اسی طرح انسان کی اصل نشوونما کے لئے بھی ضروری ہے کہ مال کی محبت' جو اصل میں علامت ہے دنیا کی محبت کی' اس کی گرفتاری سے اسے نجات ملے۔ یہ بند اور بریک کھلے گا تب ہی اس کی نشوونما کا راستہ آسان ہوگا۔

آیات ۱۸ و ۱۹ کا باہمی ربط

اب ہم اس چوتھی آیت کا تفصیلاً اور بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ دراصل دو حجابات کی وجہ سے اس کی اصل عظمت منکشف نہیں ہو پا رہی۔ سورۃ البلد کی آیات مَیں نے آپ کے سامنے پیش کی تھیں' وہاں لفظ ''ثُمَّ'' آ گیا ہے جو کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ فرمایا: ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝﴾ ''انسان گھاٹی کو عبور نہ کر پایا''۔ ﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا

الْعَقَبَةُ ۞﴾ ''اور تم نہیں جانتے کہ وہ گھاٹی کون سی ہے''۔ ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ ۞ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۞ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۞ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۞ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۞﴾ ''کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا' یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔ پھر آدمی اُن لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور (خلقِ خدا پر) رحم کی تلقین کی''۔ اب اس لفظ ''ثُمَّ'' نے وہاں پر موجود اصل مفہوم کے خزانوں کو کھول دیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ پہلے اگر آپ نے زمین تیار کی ہے' ہل چلایا ہے' پھر بیج ڈالا ہے تو وہ بیج بارآور ہوگا اور فصل اگے گی۔ لیکن آپ نے اگر زمین پہلے تیار نہیں کی' ہل چلایا ہی نہیں اور جا کر بیج ڈال دیا تو بیج بھی صاف ظاہر ہے ضائع ہو جائے گا۔ اسی طرح آپ نے اگر اپنے نفس کی یا باطنی شخصیت کی زمین میں ہل چلا لیا ہے' مال کی محبت یہاں سے نکال دی ہے تو اب جو ایمان کا بیج پڑے گا تو اس میں پوری فصل لہلہائے گی۔ چنانچہ سورۃ البلد میں فرمایا: ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۞﴾ ''پھر وہ شامل ہو اُن لوگوں میں جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور باہمی مرحمت کی تاکید کی''۔

سورۃ العصر کا مضمون بھی بالکل یہی ہے۔ سورۃ العصر کے الفاظ ہیں: ﴿وَالْعَصْرِ ۞ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۞ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۞﴾ ''قسم ہے زمانے کی' یقیناً تمام انسان خسارے میں ہیں' سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے اور ایک دوسرے کو حق بات کی تاکید اور صبر کی تلقین کی''۔ فرق صرف یہ ہے کہ ترتیب بدل گئی ہے۔ سورۃ العصر میں پہلے ایمان ہے' پھر عمل صالح ہے' پھر تواصی بالحق ہے اور پھر تواصی بالصبر ہے۔ جبکہ یہاں دونوں جوڑوں میں ترتیب الٹ گئی ہے۔ عمل صالح پہلے آیا ہے اور ایمان بعد میں۔ پہلے فرمایا: ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ ۞ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۞ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۞ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۞﴾ ''کسی گردن کو غلامی سے

چھڑانا' یا فاقے کے دن کسی قرابت دار یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا'' یہ عمل صالح ہے۔ آگے فرمایا: ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''پھر وہ شامل ہوا اُن لوگوں میں جو ایمان لائے''۔ یہاں ایمان بعد میں آ رہا ہے۔ اسی طرح تواصی بالحق بعد میں آ رہا ہے اور تواصی بالصبر پہلے آ رہا ہے۔ فرمایا: ﴿وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾ ''اور انہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور باہمی مرحمت کی تاکید کی''۔ یہاں ''تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ'' گویا ''تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ'' کی جگہ ہے۔ لیکن عمل صالح اور ایمان کو جوڑنے والی جو چیز ہے وہ لفظ ''ثُمَّ'' ہے' جس نے کہ حقائق کے خزانے کا دروازہ کھول دیا ہے۔ یہاں (سورۃ الحدید کی آیت ۱۸ اور ۱۹ کے مابین) چونکہ ایسا کوئی لفظ نہیں ہے لہٰذا یہاں تدبر کی ضرورت ہوگی کہ ان دونوں آیتوں میں ربط کیا ہے۔

ان دونوں آیات کا ترجمہ یوں ہے: ''یقیناً صدقہ دینے والے مَرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جو لوگ اللہ کو قرض دیں قرضِ حسنہ' ان کے لئے ان کا دیا ہوا مال بڑھایا جاتا رہے گا اور ان کو اجر ملے گا بہت ہی باعزت۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر وہ صدیق اور شہید ہیں''۔ ان دونوں آیات کے درمیان بھی گویا لفظ ''ثُمَّ'' محذوف ہے۔ اور یہ آپ کی سمجھ میں اُس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک یہ دو اصول سامنے نہ ہوں۔ ایک تو یہ کہ قرآن مجید کی آیات کے مابین بڑا گہرا ربط ہے۔ اس کی اہمیت بھی بہت کم لوگوں کے سامنے آئی ہے اور بہت کم لوگوں نے اس پر توجہ کی ہے کہ آیاتِ قرآنی باہم مربوط ہونی چاہئیں۔ اگر آپ نے علیحدہ علیحدہ آیت پر غور کر کے کچھ علم' معرفت' فہم اور ہدایت حاصل کی اور اس پر اکتفا کر لیا تو یقیناً وہ بھی بہت بڑی قیمتی متاع ہے' لیکن آیات کے باہمی ربط سے اس کے حسن معنوی کے کچھ اور پہلو بھی نمایاں اور منکشف ہوتے ہیں' جو یہاں لفظ ''ثُمَّ'' کے نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہ گئے ہیں۔

دوسرا اصول یہ سامنے رہنا چاہئے کہ ''اَلْقُرْآنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا'' یعنی قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے۔ اس اصول کو سب لوگ تسلیم کرتے ہیں' لیکن

اس کا انطباق اور اس کا حق ادا کرنا' یہ اپنی جگہ پر ایک دوسرا مرحلہ ہے۔ لہٰذا یہاں پر اِن دونوں اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے لفظ ''ثُمَّ'' کو محذوف سمجھئے۔ یعنی وہ لوگ جو صدقات کے ذریعے اور اللہ کو قرضِ حسنہ دے کر اپنے دلوں سے مال کی محبت اور اس کی نجاست کو دھو ڈالتے ہیں' پھر وہ جب ایمان لاتے ہیں تو اب ان کے لئے مقامِ صدیقیت اور مرتبۂ شہادت تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔ اب گویا وہ بریک کھل گئی' اب آگے بڑھنے کے لئے راستے کھلے ہیں۔ آگے بڑھنے کے اعتبار سے یہاں صدیقیت اور شہادت کے مراتب کا تذکرہ ہوا ہے۔ بدقسمتی سے ان اصطلاحات پر بھی توجہ بہت کم ہوئی ہے۔ میں آج آپ کے سامنے ان چیزوں کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کروں گا۔

قرآنی اصطلاح کے طور پر ''شہید'' کا مفہوم

اب دوسرے حجاب کو سمجھئے۔ لفظ ''شہید'' کے عام طور پر دو مفہوم ہیں۔ ان میں سے قرآن مجید کے اعتبار سے جو مفہوم زیادہ اہم ہے وہ کچھ اور ہے' وہ مَیں آگے چل کر بیان کروں گا۔ لیکن بدقسمتی سے دوسرا مفہوم جو اِس لفظ کا شاذ مفہوم ہے اور قرآن میں تقریباً ذکر ہی نہیں ہوا' وہ عام اور رائج ہو گیا ہے۔ وہ مفہوم اس آیت کے اصل فہم میں پردہ اور حجاب بن گیا ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں شہید کے معنی ''اللہ کی راہ میں قتل ہونے والا'' لئے جاتے ہیں۔ پورے قرآن مجید میں یہ لفظ اس معنی میں کہیں نہیں آیا سوائے سورۂ آل عمران کی ایک آیت کے' جہاں صرف امکان ہے کہ وہ معنی لئے جا سکیں۔ ورنہ اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے کے لئے بھی لفظ مقتول فی سبیل اللہ آیا ہے۔ جیسے فرمایا گیا ہے: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ﴾ (البقرۃ:۱۵۴) ''اور ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں مُردہ مت کہو!'' اور ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ﴾ (آل عمران:۱۶۹) ''اور ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں' مُردہ مت گمان کرو!'' قرآن میں نبیوں اور رسولوں کے لئے بھی قتل کے الفاظ ذکر ہوئے ہیں۔ جیسے: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ ؕ﴾ (آل عمران:۱۴۴) ''اور محمد (ﷺ) نہیں ہیں مگر ایک رسول' ان سے پہلے بھی کئی رسول گزر ے ہیں' تو کیا اگر اُن پر موت آ جائے یا وہ قتل کر دیئے جائیں (اللہ کی راہ میں) تو تم لوٹ جاؤ گے اپنی ایڑیوں کے بل؟''

قرآن مجید کے کسی مقام پر بھی یہ لازم نہیں آتا کہ مقتول فی سبیل اللہ کے لئے لفظ ''شہید'' ہی ترجمہ کیا جائے۔ سورۂ آل عمران کی ایک آیت میں صرف امکان ہے کہ مقتول فی سبیل اللہ کے لئے لفظ ''شہید'' ترجمہ کیا جائے۔ اس آیت میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ﴾ (آیت ۱۴۰) ''اللہ چاہتا ہے (ان آزمائشوں کے ذریعے) کہ تم میں سے کچھ کو اپنا گواہ بنا لے'' یا ''تم میں سے کچھ کو اللہ اپنی راہ میں قتل ہونے کا مرتبہ عطا کر دے''۔ ذہنوں میں اس لفظ ''شہید'' کا مفہوم یہ بیٹھ گیا ہے کہ ''اللہ کی راہ میں قتل ہونے والا''۔ اگرچہ حدیث میں یہ لفظ مقتول فی سبیل اللہ کے لئے آیا ہے لیکن وہ بابِ استفعال سے ''اُسْتُشْهِدَ'' کی صورت میں ہے کہ اس کی شہادت قبول کر لی گئی' اس کو شہادت کا مرتبہ دے دیا گیا۔ لیکن عام طور پر ہماری زبانوں پر یہ لفظِ شہید اُس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جو اللہ کی راہ میں قتل ہو گیا ہو۔

اس غلط فہمی کے نتیجے میں اس آیت کی قراءت کا بھی فرق پڑ گیا ہے۔ چنانچہ اب اس آیت ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ﴾ کے ظاہری مفہوم سے پہلا سوال تو یہ پیدا ہو گیا ہے کہ کیا سب کے سب مؤمن صدیق ہیں جو ایمان لائے ہیں اللہ اور اس کے رسولوں پر؟ اگر آپ اس آیت کو پچھلی آیت سے کاٹ کر یہاں استیناف سمجھیں گے اور پچھلی آیت سے اس کا ربط پیش نظر نہیں ہو گا تو اس کا مطلب تو یہی ہو گا کہ جو لوگ بھی ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر وہ صدیق ہیں! پھر چونکہ شہید صدیق سے الگ ایک علیحدہ مفہوم کا لفظ سمجھا جا رہا ہے یعنی ''اللہ کی راہ میں قتل ہونے والا'' تو اس بنا پر اکثر حضرات نے ''هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ'' پر وقف کر کے ﴿وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ﴾ کو ایک علیحدہ جملہ مانا ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ ہمارے یہاں قرآن مجید میں ''الصِّدِّیْقُوْنَ'' اور ''وَالشُّھَدَآءُ'' کے مابین وقف کی علامت لگی ہوتی ہے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اسلاف میں سے حضرت مجاہدؒ جو تابعی ہیں اور علم قرآن اور علم تفسیر کی بڑی بڑی شخصیتوں اور بزرگوں میں سے ہیں' ان کی رائے یہ ہے کہ یہاں پر ﴿اُولٰئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّھَدَآءُ عِنْدَ رَبِّھِمْ﴾ کلامِ مسلسل ہے' لہٰذا اسے بغیر وقف کئے رواں پڑھا جائے گا۔

اب آپ سمجھئے کہ اس لفظ ''شہید'' کا اصل مفہوم کیا ہے؟ دیکھئے ''صِدِّیق'' اور ''شَھِیْد'' قرآن کریم کی دو اہم اصطلاحات ہیں۔ اصطلاحات میں صرف لغوی معانی معتبر نہیں ہوا کرتے' بلکہ لغوی مفہوم کی بنیاد پر اصطلاحی مفہوم کو سمجھنا ہوتا ہے۔ جیسے ''اَمن'' سے ''اِیمان'' بنا ہے' اب ''اِیمان'' نے جب اصطلاح کی شکل اختیار کی تو اس کے معنی ہیں: اَلتَّصْدِیْقُ بِمَا جَآءَ بِہِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ اسی طرح صِدِّیْق' فِعِّیْل کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ لہٰذا صِدِّیْق سے مراد ہے انتہائی راست گو' راست باز' راست روانسان' کہ جو ہر اچھی بات کی تصدیق کے لئے ہر وقت آمادہ رہے۔ اور اصطلاحاً اس سے مراد وہ سلیم الفطرت لوگ ہیں کہ جن کے لئے نبی کی دعوت ہرگز اجنبی نہیں ہوتی۔ جیسے ہی نبی کی دعوت اُن کے کانوں تک پہنچتی ہے انہیں ایسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان کے دل کی آواز ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

اُن کی فطرت اپنی سلامتی پر برقرار ہوتی ہے۔ وہ غور و فکر اور سوچ بچار کرنے والے لوگ ہوتے ہیں' انہیں خود اپنے اندر سے وہ گواہی ابھرتی ہوئی نظر آ رہی ہوتی ہے' لہٰذا جیسے ہی نبی کی دعوت اُن تک پہنچتی ہے فوراً تصدیق کر دیتے ہیں۔ اس کی سب سے نمایاں مثال حضرت صدیق اکبر (رضی اللہ عنہ) ہیں' جن کے بارے میں خود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ میں نے جس کے سامنے بھی اپنی دعوت رکھی ہے اس نے کچھ نہ کچھ تأمل ضرور کیا ہے سوائے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے۔ انہوں نے ایک لحظہ کی تاخیر کے بغیر تصدیق کی ہے تو

یقیناً یہ صرف اس لئے ہوا ہے کہ یہ چیز پہلے سے ان کی فطرت میں موجود تھی' ورنہ تو یہ بہت بڑا دعویٰ تھا' نبوت و رسالت کا دعویٰ کوئی معمولی دعویٰ تو نہیں ہے۔

اسی طرح اب لفظ ''شہید'' پر غور کیجئے! ''شہید'' کے لغوی معنی ہیں ''جو موجود ہو''۔ شَھِدَ' یَشْھَدُ کا مطلب ہے موجود ہونا۔ شاہد و غائب کے الفاظ ہماری عام بول چال میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ شاہد اسے کہتے ہیں جو موجود ہو اور غائب وہ جو موجود نہ ہو۔ اب اسی لغوی معنی سے اس میں دو اضافی مفہوم پیدا ہوئے۔ غور کیجئے کہ جو شخص کسی وقوعہ کے وقت موجود ہو تو اُسی کی گواہی معتبر ہوتی ہے' لہٰذا جو موجود ہے وہ گواہ ہے۔ اگر کہیں کوئی حادثہ ہوا ہے' کسی کا قتل ہو گیا ہے' یا کوئی اور جرم ہوا ہے' تو جو اُس وقوعہ کے وقت موجود ہو گا وہی تو گواہی دینے کا اہل ہے۔ لہٰذا گواہی موجودگی کی بنا پر ہوتی ہے۔ اور اسی لغوی معنی کی بنیاد پر اِس کے معنی مددگار کے بھی ہیں۔ اس لئے کہ جو کسی ضرورت کے وقت موجود ہو گا وہی مدد کر سکے گا۔ فرض کیجئے آپ کا کوئی بہت ہی جگری' وفادار اور مخلص دوست ہے' لیکن جب وہ وقوعہ پر موجود ہی نہیں ہے تو وہ آپ کی مدد کیسے کر سکے گا؟ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳ میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۝﴾

''اگر تمہیں کوئی شک ہے اُس چیز کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر نازل کی ہے تو پھر تم بھی اس جیسی کوئی ایک سورۃ بنا کر لے آؤ اور اس کے لئے تم اللہ کے مقابلے میں اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو (جس کو چاہو جمع کر لو اور اپنی ساری صلاحیت کو بھی مجتمع کر لو اور اُس کا مقابلہ کر لو) اگر تم سچے ہو۔''

یعنی فی الواقع تو تمہیں اِس کے اللہ کا کلام ہونے میں کوئی شک نہیں ہے' لیکن تم صرف بات بنا رہے ہو' تمہارا دل تو گواہی دے رہا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ تو وہاں ''اَلشُّھَدَآء'' کے معنی مددگار کے ہیں۔ بہرحال یہاں پر اصطلاحاً شہید سے مراد وہ

شخص ہے جو اللہ کی طرف سے اپنی دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے لوگوں پر دنیا میں گواہی قائم کرے' حجت قائم کرے اور پھر یہ کہ قیامت کے دن بھی کھڑے ہو کر وہ گواہی دے کہ اے اللہ! میں نے تیرے بندوں تک تیرا یہ پیغام پہنچا دیا تھا' لہٰذا اب یہ خود ذمہ دار ہیں۔ منصبِ رسالت کے لئے قرآن مجید میں یہ لفظ ''شہادت'' انتہائی کثرت کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ رسول دنیا میں حق کی گواہی دیتا تھا۔ (مَیں نے یہاں ماضی کا صیغہ اس لئے استعمال کیا ہے کہ اب یہ سلسلۂ نبوت و رسالت بند ہو چکا ہے۔) یہ فریضۂ منصبی بحیثیت مجموعی اُمت کو ادا کرنا ہے' اب یہ اُمت کا فریضۂ رسالت ہے۔ اب شخصی رسالت نبوت کے ختم ہونے کے ساتھ ختم ہو چکی ہے۔ نبی دنیا میں اپنے قول و عمل سے حق کی گواہی دیتا تھا' وہ جو کہتا تھا کر کے دکھاتا تھا' تاکہ ثابت ہو جائے کہ جس بات کی طرف بلایا جا رہا ہے وہ ناقابل عمل نہیں ہے' یہ دعوت صرف لفاظی نہیں ہے' بلکہ قابل عمل ہے۔ اور پھر یہ کہ حضور اکرم ﷺ نے تو اِس نظامِ حیات کو قائم کر کے دکھا دیا کہ یہ نظام قائم ہو سکتا ہے اور قائم کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر حضور ﷺ نے یہ نظام چلا کر بھی دکھا دیا' تاکہ حجت اپنے آخری درجے کو پہنچ جائے۔ اسی کا نام اتمامِ حجت ہے۔ چنانچہ قیامت کے دن رسول استغاثہ کے چشم دید گواہ (Prosecution witness) کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے اور گواہی دیں گے۔[1] ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ (النساء: ٤١)

''پس اُس (قیامت کے) دن کیا حال ہو گا جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور آپؐ کو بھی (اے محمد ﷺ) اِن لوگوں کے خلاف بطورِ گواہ کھڑا کریں گے!''

اس آیت سے متعلق ایک واقعہ بھی ہے جو ہمارے لئے بہت ہی عبرت انگیز اور سبق آموز ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے

(۱) مَیں نے اس موضوع پر بڑی مفصل تقاریر کی ہیں۔ ''قرآن کا فلسفۂ شہادت'' کے عنوان سے اس کے کیسٹس موجود ہیں۔

فرمائش کی کہ مجھے قرآن سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا حضور! آپ کو قرآن سناؤں؟ آپ پر تو یہ نازل ہوا ہے۔ فرمایا: ''ہاں یہ ٹھیک ہے' لیکن مجھے دوسروں سے سن کر کچھ اور لذت حاصل ہوتی ہے''۔ اب انہوں نے امتثالاً للامر (حکم کی بجا آوری میں) سورۃ النساء کی پہلی آیت سے تلاوت شروع کی اور پڑھتے گئے۔ جب آیت ۴۱ پر پہنچے: ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا﴾ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''اب بس کرو!'' جب حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ (یہ حدیث متفق علیہ ہے۔)

ہر اُمت کی طرف جو بھی رسول بھیجے گئے تھے (علیہ الصلوٰۃ والسلام) وہ رسول قیامت کے دن سرکاری گواہ کی حیثیت سے کھڑے ہو کر گواہی دیں گے کہ اے اللہ! تیرا جو پیغام مجھ تک آیا تھا' میں نے ان تک پہنچا دیا۔ اب یہ اپنے طرزِ عمل کے خود ذمہ دار ہیں' خود جواب دہ ہیں۔ متذکرہ بالا آیت کا اگلا حصہ ہے: ﴿وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا﴾ ''اور (اے نبیؐ!) آپ کو ہم لائیں گے ان کے خلاف گواہ کے طور پر''۔ نوٹ کیجئے ''علٰی'' کا صلہ جب بھی آتا ہے وہ مخالفت کے لئے ہوتا ہے۔ جیسا کہ بہت ہی مشہور حدیث ہے: ((اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَّكَ اَوْ عَلَيْكَ)) ''قرآن یا تو تمہارے حق میں حجت ہوگا یا تمہارے خلاف حجت بنے گا''۔ شہادت کسی کے حق میں ہوتی ہے اور کسی کے خلاف ہوتی ہے۔ ہر شخص جو گواہ کی حیثیت سے پیش ہوتا ہے' اس کی گواہی کسی کے حق میں اور کسی کے خلاف جاتی ہے۔ جب یہ گواہی ''لِ'' کے صلے کے ساتھ آتی ہے تو کسی کے حق میں جا رہی ہوتی ہے۔ جیسے سورۃ النساء میں ارشاد ہوا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ﴾ (آیت ۱۳۵) ''اے اہل ایمان! کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لئے اللہ کے حق میں گواہی دینے کے لئے''۔ لیکن یہ خاص طور پر نوٹ کیجئے کہ اکثر و بیشتر اس کے ساتھ ''علٰی'' کا صلہ لگتا ہے۔ قیامت کے دن جب ہمارے اپنے اعضاء و جوارح ہمارے خلاف گواہی دیں گے تو ہم کہیں گے: ﴿لِمَ شَهِدتُّمْ عَلَيْنَا﴾ ''تم نے ہمارے خلاف

گواہی کیوں دے دی؟'' تم ہمارے اپنے اعضاء و جوارح ہو کر ہمارے خلاف گواہی دے رہے ہو؟ ہمارے یہ اعضاء و جوارح جواب میں کہیں گے: ﴿اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ﴾ (حٰمٓ السجدۃ :۲۱) ''آج اس اللہ نے ہمیں بھی گویائی عطا کر دی ہے جس نے ہر شے کو نطق و گویائی عطا کی ہے''۔ جہاں بھی رسالت کی گواہی کے لئے یہ لفظ آیا ہے 'علیٰ'' کے ساتھ آیا ہے۔ سورۃ المزمل میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّا اَرْسَلْنَا اِلَیْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَیْكُمْ كَمَا اَرْسَلْنَا اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۝﴾ ''(دیکھو لوگو!) ہم نے بھیج دیا ہے تمہاری طرف اپنا ایک رسول تمہارے خلاف گواہ کی حیثیت سے' جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا''۔

رسول دنیا میں تو لوگوں کو حق کی دعوت دیتا ہے' وہ ان کے لئے جو اُس کی دعوت کو قبول کر لیں رحمتِ خداوندی کا مظہر بن جاتا ہے' لیکن جنہوں نے اس کی دعوت کو رد کر دیا اُن پر گویا حجت قائم ہو گئی۔ قیامت کے دن اب وہی رسول کھڑا ہو کر اُن لوگوں کے خلاف گواہی دے گا کہ اے اللہ! میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا تھا' میری طرف سے کوتاہی نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور ﷺ نے' جبکہ سوا لاکھ کا مجمع سامنے تھا' یہ سوال کر کے گواہی لے لی: ((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟)) ''لوگو! میں نے پہنچا دیا کہ نہیں؟'' میری طرف سے حق تبلیغ میں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی؟ اور پورے مجمع نے یک زبان ہو کر کہا: ''اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ ''یعنی ''ہم گواہ ہیں کہ آپ نے حق رسالت ادا کر دیا' حق امانت ادا کر دیا اور ہماری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا''۔ بلکہ ایک روایت میں تو یہ تفصیل ہے: ''اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَاَدَّیْتَ الْاَمَانَةَ وَنَصَحْتَ الْاُمَّةَ وَكَشَفْتَ الْغُمَّةَ ''یعنی ''ہاں حضور! ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے رسالت کا حق ادا کر دیا' امانت کا حق ادا کر دیا' اُمت کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا اور گمراہی کے اندھیروں کے پردے چاک کر دیئے''۔ اب حضور ﷺ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور انگشتِ شہادت سے آسمان کی طرف اور پھر لوگوں کی طرف اشارہ کیا: ((اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ' اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ' اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ)) ''اے اللہ تو بھی گواہ رہ!

اے اللہ تو بھی گواہ رہ! اے اللہ تو بھی گواہ رہ!'' انہوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ مَیں نے انہیں تیرا پیغام پہنچانے کا حق ادا کر دیا ہے۔ پھر حضور ﷺ نے لوگوں سے فرمایا: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) ''اب پہنچائے وہ جو یہاں ہے اُس کو جو یہاں نہیں ہے''۔ یہ ہے اصل میں اُمت کا فریضۂ رسالت۔ اللہ نے بھیجا ہے محمد رسول اللہ ﷺ کو اور محمد ﷺ نے اپنا یہ فریضۂ منصبی اُمت کے حوالے کیا۔ اس لئے کہ حضور ﷺ تو پوری نوعِ انسانی کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ ''اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام انسانوں کے لئے خوش خبری دینے والا اور ڈر سنانے والا بنا کر''۔ اور حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں تو اتمامِ حجت اگر ہوا ہے تو صرف جزیرہ نمائے عرب کے مسلمانوں پر ہوا ہے' قیصر و کسریٰ کو تو آپ ﷺ کے ابھی صرف خطوط ہی گئے تھے' ایران کے لوگوں کو ابھی کیا معلوم تھا کہ وہ دعوت کیا ہے؟ رومیوں کو کیا پتہ تھا کہ وہ دعوت کیا ہے؟ اس کے دلائل کیا ہیں؟ دعوت کے اتمامِ حجت کی حد تک تو فریضہ ادا نہیں ہوا۔ تو یہ کام اب مسلمانوں نے کرنا ہے۔

اب نوٹ کیجئے کہ یہ ہے اصل میں شہادت! اور قرآن مجید میں دو جگہوں پر اسی مفہوم کو بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں یہ مضمون اِن الفاظ میں آیا ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ﴾ (آیت ۱۴۳) ''اور اسی طرح ہم نے تمہیں اُمت وسط بنایا ہے تاکہ تم پوری نوعِ انسانی پر گواہی دو (حجت قائم کرو) اور ہمارے رسول تم پر گواہی قائم کریں (حجت قائم کر دیں)''۔ یہ وہ گواہی ہے جو قیامت کے دن ظاہر ہو جائے گی۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰي هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ۝﴾ ''پس کیا حال ہوگا (اُس دن) جب ہم ہر اُمت میں ایک گواہ کھڑا کریں گے اور آپ کو (اے نبیؐ!) کھڑا کریں گے ان کے خلاف بطورِ گواہ''۔ اس کے بعد اگلی آیت میں فرمایا: ﴿يَوْمَىِٕذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۭ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۝﴾ ''اُس دن جن

لوگوں نے (اس دنیا میں) کفر و انکار کیا تھا' اور رسول (ﷺ) کی نافرمانی کی تھی' تمنا کریں گے کہ کاش وہ زمین میں دھنسا دیئے جائیں! (اُن کے اوپر زمین برابر ہو جائے' نیست و نابود ہو جائیں' ان کا وجود ہی باقی نہ رہے) لیکن وہ وہاں کوئی بات اللہ سے چھپا نہیں سکیں گے''۔

شہادت علی الناس کا یہی مضمون سورۃ الحج کے اخیر میں آیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ ''اور جہاد کرو اللہ کے لئے جیسا کہ اس کے لئے جہاد کا حق ہے''۔ اور یہ جہاد کس لئے ہوگا؟ ﴿هُوَ اجْتَبٰىكُمْ﴾ ''اس نے تمہیں چن لیا ہے''۔ اپنے نصیب پر فخر کرو کہ یہ اُمت مسلمہ اس سلسلۂ رسالت میں ایک کڑی (link) کی حیثیت سے تا قیامِ قیامت جوڑ دی گئی ہے۔ سورۃ الحج کے آخری رکوع میں پہلے یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ ''اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے بھی اپنے پیغام بر اور انسانوں میں سے بھی''۔ اور اب اس کے بعد فرمایا ہے: ﴿هُوَ اجْتَبٰىكُمْ﴾ اس نے تمہیں چن لیا ہے' تمہیں پسند کر لیا ہے۔ اس فریضۂ شہادت علی الناس کی ادائیگی کے لئے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ اب آخری رسول تو ہمارے محمد ﷺ ہیں اور باقی نوعِ انسانی پر تا قیامِ قیامت یہ شہادت کی ذمہ داری ادا کرنا تمہارے ذمہ ہے۔ اور ذرا آگے چل کر فرمایا کہ یہ محنت اس لئے کرنی ہے کہ: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ ''تا کہ رسول تم پر گواہ ہو جائیں اور تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ''۔ یہ ہے قرآن میں شہادت کا اصل مفہوم۔ یہی وجہ ہے کہ تمام رسولوں کو ''شہید'' کہا گیا' حالانکہ رسول تو قتل ہوئے ہی نہیں۔ انبیاء ضرور قتل ہوئے ہیں' لیکن کوئی رسول قتل نہیں ہوا۔ حضرت مسیح علیہ السلام رسول تھے' یہودیوں نے انہیں قتل کرنے کی کوشش کی تو اللہ نے انہیں زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ﴾ ''انہوں نے نہ تو اسے قتل کیا اور نہ سولی دی''۔ بہر حال یہاں پر (سورۃ الحدید میں) شہید کا مفہوم عام لوگوں نے چونکہ ''مقتول فی سبیل اللہ'' لیا ہے تو اس کی وجہ سے وہ الجھنیں پیدا ہو گئیں جن کی بناء پر اس آیت کی اصل عظمت لوگوں پر منکشف نہیں ہوئی۔

صدیقیت اور شہادت کی حقیقت

اب آپ ان دونوں اصطلاحات ''صدیقیت'' اور ''شہادت'' کی اصل حقیقت کو سمجھئے! دیکھئے سورۃ الفاتحہ کی پانچویں آیت کے الفاظ ہیں: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۞﴾ اور چھٹی آیت میں الفاظ آتے ہیں: ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ ''راستہ اُن کا جن پر تیرا انعام ہوا''۔ لیکن وہ کون لوگ ہیں جن پر اللہ کا انعام ہوا' اس کی وہاں پر کوئی وضاحت نہیں ہے۔ اس کی وضاحت سورۃ النساء کی آیت ۶۹ میں بایں الفاظ کر دی گئی: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ ''جو کوئی بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حق ادا کر دے گا تو یہ وہ لوگ ہوں گے جو اُن کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا''۔ اور وہ کون لوگ ہیں؟ ﴿مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۞﴾ ''یعنی انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین۔ اور کیا ہی خوب ہے ان کی رفاقت''۔ تو یہ منعم علیہم چار گروہ ہیں: انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین۔ ان میں نبوت سرفہرست ہے۔ ''صالحیت'' گویا ان چار مراتب کی base line ہے۔ اس کے اوپر شہداء' ان کے اوپر صدیقین اور سب سے اوپر انبیاء ہیں۔ ظاہر بات ہے نبوت تو پہلے بھی ہمیشہ وہبی شے تھی' کسبی نہیں تھی' کوئی شخص اپنی محنت و مشقت' ریاضت و عبادت اور کسی سلوک کی منازل طے کرنے سے نبوت حاصل نہیں کر سکتا تھا' یہ خالص وہبی شے تھی' جس کا دروازہ اب ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا۔ تو گویا عام انسانوں کے لئے تین درجے کھلے ہوئے ہیں: صالحین' شہداء اور صدیقین۔

صدیق اور شہید کے مابین فرق کیا ہے' یہ جان لیجئے۔ ذرا نوٹ کیجئے' سورۂ مریم میں حضرت ابراہیم اور حضرت ادریس علیہما السلام کے بارے میں ﴿صِدِّيْقًا نَّبِيًّا﴾ جبکہ حضرت موسیٰ اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے بارے میں ﴿رَسُوْلًا نَّبِيًّا﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ قرآن کریم کا ایک خاصا مشکل مقام ہے کہ ان کے درمیان فرق کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی شخصیت کے جو سانچے

(personality patterns) بنائے ہیں ان میں دو تقسیمیں بہت نمایاں ہیں۔ جدید سائیکالوجی میں آپ انہیں دروں بیں (introvert) اور بروں بیں (extrovert) کہتے ہیں۔ مقدم الذکر لوگ غور وفکر کرنے والے' سوچ بچار میں منہمک' تنہائی پسند اور سلیم الفطرت ہوتے ہیں' جبکہ مؤخر الذکر لوگ فعّال قسم کے' بھاگ دوڑ کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہ باہر کی دنیا میں مگن رہتے ہیں اور انہیں اپنے باطن میں جھانکنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ان کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ خوب گفتگوئیں ہو رہی ہیں' مجلسوں میں خوب بحث ہو رہی ہے' خوش گپی ہو رہی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ حقائق کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوتے۔ ان دو کے علاوہ بہت شاذ لوگ (ambivert) ہوتے ہیں کہ جن کے اندر دروں بینی اور بروں بینی کی دونوں صلاحیتیں موجود ہوں اور توازن کے ساتھ ہوں۔ بلکہ اکثر و بیشتر یہ دو چیزیں اگر کسی میں جمع ہو بھی جائیں تو پھر اُس کا توازن پر قائم رہنا چونکہ مشکل ہوتا ہے اس لئے ambivert کا لفظ بالعموم اچھے مفہوم میں استعمال نہیں ہوتا۔ آدمی یکسو اور یک رخا ہو گا تو وہ زیادہ مستحکم (stable) رہے گا' جبکہ ambivert کے اندر عدمِ استحکام (instability) کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔

کسی شخصیت میں دونوں چیزیں موجود ہوں اور توازن کے ساتھ برقرار ہوں تو اس کی کامل مثال تو ایک ہی ہے اور وہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ باقی آپ کو انبیاء میں بھی دو درجہ بندیاں ملیں گی' جیسا کہ آپ کو صحابہ کرام ؓ میں دو درجہ بندیاں ملتی ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی طبیعت کے اندر شروع ہی سے رقیق القلبی موجود تھی۔ کسی کو دکھ میں دیکھتے تو تڑپ اٹھتے' ہر کسی کی تکلیف کو رفع کرنے کی کوشش کرتے۔ پھر یہ کہ سلیم الفطرت تھے' کیسے ممکن تھا کہ کسی بُت کو سجدہ کریں! اور یہ توحید تو فطرتِ انسانی کے اندر موجود ہے' وہ جو ''اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ؟ قَالُوْا بَلٰی!'' کا عہد کر کے آئے تھے اس کے اثرات اس حیاتِ دُنیوی میں موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر الصدیق ؓ نے کبھی بھی کسی بُت کو سجدہ نہیں کیا' کبھی شرک کا ارتکاب نہیں کیا' کبھی

بدکاری نہیں کی۔ گویا کہ ایک پاک طینت' صاف باطن شخصیت ہیں۔ یعنی اندر سے فطرت بھی پاک اور سلیم' اور کردار و اخلاق بھی بہت عمدہ۔ تو ایسے شخص کے سامنے جب نبی کی دعوت آتی ہے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی تاخیر ہو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مقامِ صدیقیت میں اُمت میں سب سے بلند مرتبہ ہیں اور صدیق ثانی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دعوت سے جو لوگ ایمان لائے ان میں سرفہرست حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں۔

دوسری طرف حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما ہیں' جن کا مزاج ابوبکر و عثمان رضی اللہ عنہما سے مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ میں محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو چھ برس بیت جاتے ہیں اور اِن کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی کہ محمد ﷺ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے دو مثالیں اس لئے دی ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تو حضور ﷺ کے ساتھ کوئی ایسی قرابت داری نہیں تھی' ہوسکتا ہے کہ کچھ اور بھی عوامل کارفرما ہوں' لیکن حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ تو حضور ﷺ کے چچا ہیں' خالہ زاد بھائی ہیں' دودھ شریک بھائی ہیں' ساتھ کے کھیلے ہوئے ہم جولی ہیں اور حضور ﷺ کے ساتھ انتہائی محبت کرتے ہیں۔ بتایئے کون سا حجاب ہے؟ کیوں نہیں ایمان لائے چھ برس تک؟ اس لئے کہ اُدھر توجہ ہی نہیں ہے۔ سیر و شکار سے فرصت نہیں ہے' کئی کئی دن تک تیر کمان لے کر صحرا کے اندر شکار میں مصروف ہیں۔ غور و فکر اور سوچ بچار والا مزاج ہی نہیں ہے۔ ادھر توجہ ہی نہیں ہے کہ یہ کائنات کیا ہے' اس کا بنانے والا کون ہے اور اس زندگی کا مقصد کیا ہے؟ صرف عدم توجہی ہے' ورنہ حضور ﷺ سے عناد ہونے کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ کوئی منفی عامل سرے سے موجود ہی نہیں ہے سوائے عدم توجہی کے۔ چنانچہ چھ برس بعد ایمان لائے ہیں اور وہ بھی جذباتی طور پر۔ شکار سے واپس آئے تو کنیز (حضرت فوزیہ رضی اللہ عنہا) نے کہا کہ آج تو ابوجہل نے آپ کے بھتیجے (محمد ﷺ) پر بڑی زیادتی کی ہے' بہت گستاخی کے ساتھ پیش آیا ہے۔ پس وہ جو دل میں محبت تھی اس نے جوش مارا اور سیدھے ابوجہل کے پاس پہنچے جہاں وہ اپنی پارٹی کو لے کر بیٹھا ہوا تھا' جاتے ہی

کمان اس کے سر پر دے ماری جس سے سر پھٹ گیا۔ اس سے کہنے لگے کہ تمہاری یہ ہمت کہ تم نے میرے بھتیجے کے ساتھ یہ معاملہ کیا! اور پھر اسی وقت کہا کہ اچھا میں اس پر ایمان لاتا ہوں' آؤ مقابلہ کرو! یہ شان ہے حضرت حمزہ ؓ کے ایمان کی۔ تو اس کو ذرا اچھی طرح سمجھئے۔ اِن دو شخصیتوں کا فرق اگر نہیں سمجھیں گے' اور یہ جو اللہ تعالیٰ نے مختلف انسانوں کے مختلف مزاج بنائے ہیں ان کا جب تک فہم و شعور نہ ہوگا یہ آیت سمجھ میں نہیں آئے گی' اور یہ کہ صدیقیت اور شہادت کسے کہتے ہیں' یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ شہید کے معنی صرف مقتول فی سبیل اللہ ہی ذہن میں رہ جائیں گے اور یہ جو قرآن مجید کے اصل حقائق و معارف ہیں ان سے محرومی رہے گی۔

یہی معاملہ حضرت عمر ؓ کا ہے۔ ان کے ہاں تو معاملہ اس سے آگے بڑھ کر عصبیت جاہلی کا تھا کہ محمد (ﷺ) تو ہمارے آبائی دین اور آبائی عقائد کی نفی کر رہے ہیں' یہاں تک کہ بالآخر وہ دشمنی اس انتہا کو پہنچ گئی کہ گھر سے تلوار لے کر یہ فیصلہ کر کے نکلے ہیں کہ آج میں ان کا کام تمام کر دوں گا۔ کفارِ مکہ درحقیقت یہ دیکھ رہے تھے کہ بنو ہاشم محمد (ﷺ) کی پشت پناہی کر رہے ہیں' اب اگر ہم نے محمد (ﷺ) کو کوئی گزند پہنچا دیا تو بنو ہاشم ان کے انتقام کے لئے کھڑے ہو جائیں گے' اس طرح ہمارا آپس کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا' عرب کے اندر ہماری حیثیت مجروح ہو جائے گی' بلکہ ہماری قبائلی جنگ شروع ہو جائے گی۔ ان کے لئے رکاوٹ صرف یہی تھی۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ اب تو پانی سر سے گزر رہا ہے' گھر گھر میں لڑائی ہو رہی ہے' بھائی بھائی سے کٹ گیا ہے' بیوی شوہر سے جدا ہو رہی ہے' شوہر بیوی سے کٹ گیا ہے' والدین سے اولاد علیحدہ ہو گئی ہے تو ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کے مصداق عمر بن خطاب نے فیصلہ کر لیا کہ اب تو جو ہو سو ہو' میں تو انہیں قتل کر دوں گا۔ چنانچہ سیف بدست نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں حضرت حذیفہؓ بن عتبہ ملے' وہ ایمان لا چکے تھے' لیکن عمر کو معلوم نہیں تھا۔ انہوں نے کہا کہ عمر کیا بات ہے؟ اتنے جوش و جلال کے ساتھ کہاں چلے؟ کہا کہ میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ آج یہ جھگڑا ختم کر کے رہوں گا' میں محمد (ﷺ) کو قتل کرنے

جارہا ہوں۔ انہوں نے بڑی حکمت سے یہ کہہ کر ان کا رخ موڑ دیا کہ تمہارے تو اپنے بہن اور بہنوئی ایمان لا چکے ہیں! اب غصے میں آگ بگولہ ہو کر اپنی حقیقی بہن فاطمہ بنت خطاب اور بہنوئی سعید بن زید (رضی اللہ عنہما) کے ہاں پہنچے اور غصہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ اندر قرآن مجید پڑھ رہے تھے۔ وہاں حضرت خباب بن اَرت رضی اللہ عنہ انہیں قرآن پڑھانے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ سورۂ طٰہٰ کی آیات نازل ہوئی تھیں اور وہ آ کر انہیں سنا رہے تھے۔ عمر کی آواز سن کر انہوں نے حضرت خباب ؓ کو تو چھپا لیا۔ عمر نے گھر میں داخل ہو کر بہنوئی حضرت سعیدؓ کو مارنا شروع کیا۔ بہن درمیان میں آئیں تو اُن کو بھی ایک ایسا تھپڑ لگایا کہ چہرہ لہولہان ہو گیا۔ لیکن بہن کی زبان سے یہ جملہ نکلا: عمر! چاہے تم ہمیں جان سے مار دو' اب ہم اس دین کو چھوڑیں گے نہیں جسے ہم نے اختیار کیا ہے۔ ان کا یہی جملہ تھا جو عمر بن خطاب کے انقلاب کی وجہ بنا ع

دگرگوں کرد تقدیر عمر را!

عمر سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ صنفِ نازک میں یہ ہمت اور یہ حوصلہ کیونکر پیدا ہوا! یوں سمجھئے کہ اندر تو سب کچھ تھا' اوپر خول آیا ہوا تھا۔ بس اس خول کے اندر سوراخ ہو گیا' لیکن کسی دلیل و منطق سے نہیں' غور و فکر سے نہیں' یہ ہوا ہے جذباتی طور پر (emotionally)۔ تو اس اُمت کے دو عظیم ترین شہداء ہیں حضرت حمزہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما۔ اور اِس اُمت کے دو عظیم ترین صدیق ہیں حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما۔ اگلی نشست میں ابھی یہ مضمون آگے چلے گا' اس لئے کہ یہ معارفِ قرآن حکیم کا ایک اہم باب ہے۔ اس پر بدقسمتی سے جتنی توجہ ہونی چاہئے تھی میرے علم کی حد تک اتنی توجہ نہیں ہوئی۔

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم ونفعني وإياكم بالآيات والذكر الحكيم

فلسفہ کے بنیادی مسائل اور قرآن حکیم

تحریر : پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم

یہ مقالہ چھٹی سالانہ قرآن کانفرنس کراچی (منعقدہ مارچ ۱۹۷۹ء) میں مزید زبانی توضیحات کے ساتھ پیش کیا گیا۔ قارئین کی سہولت کے لئے قرآنی آیات کا ترجمہ بھی شامل کیا جارہا ہے۔

۱) مَیں نے غالباً ۱۹۱۷ء میں لارڈ بیکن کا یہ قول پڑھا تھا: ''فلسفے کا تھوڑا علم انسانی ذہن کو الحاد کی طرف لے جاتا ہے' لیکن فلسفے کا گہرا مطالعہ انسانی ذہن کو مذہب کی جانب مائل کر دیتا ہے!''

۲) دنیا کی تمام مذہبی کتابوں میں صرف قرآن حکیم ایسی کتاب ہے جس نے ہستیٔ باری تعالیٰ پر جس قدر عقلی براہین ممکن ہیں' سب پیش کی ہیں۔ چونکہ آنحضور ﷺ نے منطق' فلسفہ اور کلام نہ کسی استاد سے پڑھا تھا' نہ اس فن کی کوئی کتاب خود پڑھی تھی' نہ کسی فلسفی سے آپ کا کوئی رابطہ تھا' اور نہ آپؐ یونانی یا سنسکرت جانتے تھے اور نہ حجاز میں کوئی ان زبانوں کا جاننے والا تھا' اور نہ توریت یا زبور یا انجیل میں ہستیٔ باری تعالیٰ پر کوئی دلیل دی گئی ہے' اس لئے یہ بات بذاتِ خود اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن آپ ﷺ کی تصنیف نہیں ہے بلکہ تنزیلٌ من اللّٰہِ الحکیمِ الحمیدِ ہے۔

۳) جن لوگوں نے خدا کا انکار کیا' انہوں نے یہ دلیل دی کہ وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا' عقل کی گرفت میں نہیں آتا۔ لیکن یہ دلیل معقول نہیں ہے' کیونکہ سمجھ میں نہ آنا کسی شے کی نفی یا اس کے عدم کی دلیل نہیں۔ ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ ہم کیونکر

دیکھتے ہیں اور کیونکر سنتے ہیں اور کیسے گزشتہ واقعات کو یاد رکھتے ہیں' لیکن ہم جانتے اور مانتے ہیں کہ ہم یاد رکھتے ہیں۔

یہ دلیل کہ ہمارے اندر مادّے کے علاوہ ذہن بھی ہے اور یادداشت اس کا ایک وظیفہ ہے۔ اور جن لوگوں نے الحاد کے بجائے مادیت کو اختیار کیا ہے وہ آج تک یہ ثابت نہیں کر سکے کہ مادّے میں حرکت اور شعور کہاں سے اور کیسے پیدا ہو گیا۔ فلسفے کا قانون یہ ہے کہ نیستی سے ہستی نہیں ہو سکتی' عدم سے وجود نہیں ہو سکتا' تو بے شعور سے شعور کیسے سرزد ہوا؟ اکبر کا شعر ہے ۔

دعویٰ ہے خرد کا تم کو لیکن یہ کہو
پیدا ہوا مادّے میں کیونکر یہ شعور!

تمام منکرین نے somehow کہہ کر جان چھڑائی ہے[1]' مگر ان کی جان قیامت تک نہیں چھوٹ سکتی۔ جین دھرم اور سانکھ درشن دونوں منکر خدا ہیں اور دونوں نے somehow کے دامن میں پناہ لی ہے' مگر پناہ ہرگز نہیں مل سکتی' کیونکہ ہمارے سوال کی تلوار اُن کے سر پر لٹک رہی ہے' یعنی جب نفسِ ناطقہ مدرک ہے تو اُس نے صاحبِ شعور ہو کر مادّے کی قید میں گرفتاری کو کیسے قبول کر لیا؟ جب کہ کوئی ذی ہوش کسی کی قید ایک لمحے کے لئے گوارا نہیں کرتا۔ ضرور کوئی تیسری طاقت ہے جس نے انہیں مربوط کر دیا ہے اور وہ خدا ہے' اگر نظر نہیں آتا تو آتما بھی تو نظر نہیں آتی۔ تم جو دلیل آتما کے وجود پر دو گے وہی دلیل ایشور کی ہستی ثابت کر دے گی۔

فلسفے کے بنیادی مسائل دو ہی ہیں۔ پھر ان سے بہت سے مسائل متفرع ہو گئے ہیں' مسئلۂ وجود اور مسئلۂ علم۔ یہ کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ پہلی وحی میں انہی دو بنیادی مسئلوں کا جواب دیا گیا ہے:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۞ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۞ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ۞ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۞ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۞﴾

(۱) سانکھ درشن سے لے کر بریڈلے تک سب لوگ somehow میں پناہ لیتے ہیں۔ کیسے پیدا کی؟ کیوں؟ کب؟ ان سب کا جواب یہ ہے: somehow

''پڑھو (اے نبیؐ!) اپنے ربّ کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو خون کی پھٹکی سے۔ پڑھو اور تمہارا ربّ بڑا ہی کریم ہے' جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔ اُس نے انسان کو وہ علم دیا جو وہ نہ جانتا تھا''۔

اپنے ربّ کے نام سے آئندہ علوم بذریعہ وحی حاصل کرو! یعنی وجود کا منبع (origin) بھی خدا ہے اور علم کا مصدر (source) بھی خدا ہے' اس نے اپنی مرضی سے انسان کو خلعتِ وجود عطا کیا اور اُسی نے اپنی مرضی سے انسان کو زیورِ علم عطا کیا۔

۱) ہستیٔ باری تعالیٰ کا ثبوت

فلسفے میں اب تک کونیاتی' غائیاتی' کائناتی اور اخلاقی دلائل مدوّن ہوئے ہیں۔ قرآن نے ان چاروں کے علاوہ تاریخی اور وجدانی دلائل بھی پیش فرمائے ہیں۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

۱) قرآن مجید نے حکم دیا کہ جس بات کا علم نہ ہو اُس کا اتباع مت کرو۔ ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ﴾ (بنی اسرائیل:۳۶) غور کرو اس آیت میں کس قدر عظیم الشان حکمت کی تعلیم دی گئی ہے۔ پس ہمیں ہستیٔ باری تعالیٰ کا بھی علم حاصل کرنا چاہئے' یعنی خود اللہ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ انسان کو محض تقلیداً ایمان نہیں لانا چاہئے بلکہ خود علم یا یقین حاصل کرنا چاہئے تاکہ ایمان میں پختگی کی شان پیدا ہو جائے۔

۲) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنی ہستی پر جس قدر دلیلیں ہو سکتی ہیں' سب پیش کر دی ہیں۔ مَیں نے ۱۹۳۴ء میں ''The Quran and the Ultimate Reality'' کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا جو ''مسلم ریویو'' کے پچاس ساٹھ سے زائد صفحات کو محیط تھا۔ ظاہر ہے میں اسے یہاں نقل نہیں کر سکتا۔

سب سے پہلی دلیل: قرآن نے منکروں سے دو سوال کئے ہیں:

﴿اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ﴾

''کیا یہ غیر شے سے (یعنی عدم سے خالق کے بغیر) پیدا ہو گئے ہیں (موجود ہو گئے ہیں) یا یہ خود ہی اپنے اپنے خالق ہیں؟''

نوٹ: قرآن کا یہ اسلوبِ بیان قابلِ غور ہے کہ وہ دنیا جہان کی علمی' منطقی اور

سائنٹیفک بحثیں کرتا ہے، مگر فلاسفہ کی مصطلحات قصداً استعمال نہیں کرتا۔ اس کی دو وجہیں ہیں:

(۱) پھر عوام قرآن کو نہ سمجھ پاتے۔ (۲) مخالفین یہ کہتے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ مصطلحات حکمائے یونان سے مستعار لی ہیں۔ منطق میں اسے حصرِ عقلی کہتے ہیں۔ یعنی عقلاً تیسری صورت ممکن نہ ہو۔

(۱) غیرشی (معدوم) سے شے (موجود) کا صدور محال ہے۔

(۲) ذات پر تقدم (تقدم الشی علیٰ نفسہ) بھی محال ہے۔ تو عقلاً ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ انسان کسی شے سے وجود میں آیا ہے۔ یعنی کسی شے نے اسے پیدا کیا ہے۔ مَیں نے عرصہ ہوا ۱۹۱۲ء میں الٰہیات پر ایک کتاب پڑھی تھی، اس کا ایک فقرہ اب تک یاد ہے: something exists today یہ ایک صداقت ہے تو پھر: something has existed from eternity کیونکہ نیستی سے ہستی نہیں ہوسکتی —— اب بحث صرف یہ رہ جاتی ہے کہ وہ شے ذہن یا مادّہ ہے؟ لیکن اربابِ علم جانتے ہیں کہ مادّے سے ذہن وجود میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ ذہن میں ایک چیز ایسی ہے جو مادّے میں نہیں ہے اور وہ ہے شعور۔ برگسوں نے اس پر ایک معرکۃ الآراء کتاب لکھ دی: "Matter and Memory" جس میں اس نے ثابت کر دیا کہ حافظہ تو ذہن کا وظیفہ ہے نہ کہ مادّے کا۔ دوسو صفحات کی کتاب کا خلاصہ اکبر نے ایک شعر میں پیش کر دیا ہے ؎

دعویٰ ہے خرد کا تم کو لیکن یہ کہو
پیدا ہوا مادّے میں کیونکر یہ شعور؟

اور ؎

غور سے دیکھو زمین و آسماں کو منکرو!
چل بھی سکتا بے خدا کے انتظام اتنا بڑا؟

۲) دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ انسان کہاں سے آیا؟ اور اس کی حیثیت کیا ہے؟ کیا وہ بھی خدا کی طرح قدیم یا واجب ہے؟ اللہ نے اس کا بھی حتمی جواب دیا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ﴾

(فاطر:۱۵)

''لوگو! تم محتاج ہو اللہ کی طرف' اور اللہ تو غنی وحمید ہے۔''

غنی کا مطلب ہے موجود' یعنی واجب الوجود۔ یہاں بھی مصطلحاتِ فن سے اجتناب فرمایا ہے۔

۳) علت اور معلول کا سلسلہ لامتناہی نہیں ہوسکتا' کیونکہ یہ بات خلافِ عقل ہے۔ تو علت اولیٰ لازمی ہے اور وہ اللہ ہے' اللہ علت العلل ہے: ﴿وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَهٰی﴾ (النجم:۴۲) اقبالؔ کی رائے میں یہ قرآن کی عمیق ترین آیت ہے' میری رائے میں ایسی آیت پہلی ہے' لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ یہ دونوں عمیق ترین اور نہایت بصیرت افروز آیات ہیں۔

حکمت کی اہمیت اور فضلیت کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکمت کو ''خیر کثیر'' قرار دیا ہے جسے ہم خیر اعلیٰ بھی کہہ سکتے ہیں۔ خیر کی ضد شر ہے۔ قرآن پہلی مذہبی کتاب ہے جس نے حکمت کو خیرِ کثیر قرار دیا اور اس کی تحصیل کو مسلمان کا فرضِ منصبی قرار دیا۔

گفت حکمت را خدا خیر کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی' بگیر!

حکمت کے معنی ہیں اشیاء کی حقیقت کا ادراک کرنا۔ حضور ﷺ کی دعا ہے: ''اے اللہ! مجھے حقائقِ اشیاء کا علم عطا فرما!''

قرآن پہلی مذہبی کتاب ہے جس نے مطالعۂ کائنات اور مشاہدۂ فطرت کو عقل مندوں (اولوالالباب) کی شناخت قرار دیا۔

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (آل عمران:۱۹۰'۱۹۱)

"یقیناً زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری آنے میں بہت سی نشانیاں ہیں صاحبانِ خرد کے لئے۔ جو اللہ کو یاد کرتے ہیں اٹھتے' بیٹھتے اور لیٹتے (ہر حال میں) اور زمین و آسمان کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں"۔

ذکر: عشق و محبت اور فکر: عقل و خرد۔

اسلام یا قرآن نے زندگی کے چار مقاصد قرار دیئے ہیں: مادّی' جذباتی' اخلاقی' روحانی۔ اسلام نے رہبانیت کو اسی لئے ممنوع قرار دیا کہ وہ زندگی کے صرف ایک پہلو (روحانی) کو مقصود بناتی ہے۔ صدق' خیر اور جمال خدا کی شئونِ ثلاثہ ہیں۔ ان سے علم' قوت اور سعادت کا حصول ہوتا ہے۔

فلسفے کی غرض و غایت کیا ہے؟ یہ معلوم کرنا کہ: (۱) کائنات کی اصلی بنیاد کیا ہے؟ (۲) انسانی زندگی کا اصلی مفہوم اور مقصد کیا ہے؟

قرآن نے اِن بنیادی مسئلوں کا بھی جواب دیا ہے:

(۱) کائنات کی اصلی بنیاد اللہ ہے۔

(۲) انسانی زندگی کا مفہوم وہ زندگی ہے جس کے سامنے کوئی آئیڈیل ہو۔ انسانی زندگی کا مقصد اس آئیڈیل کا حصول ہے۔ وہ نصب العین خدا ہے' لہٰذا مقصدِ حیات یہ ہے کہ انسان اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرے یا بقولِ قرآن اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگ لے' یا بقولِ رسول ﷺ اپنے اندر اخلاقِ ایزدی پیدا کرے۔

ساری دنیا کی مذہبی کتابیں پڑھ جاؤ' یہ بات کسی نے نہیں کہی کہ دلیل لاؤ۔ قرآن نے انسانی ذہن کو توہمات' رسومات اور تحکمانہ عقائد اور احبار پرستی' شخصیت پرستی اور رسوم پرستی سے پاک کر کے غور و فکر یعنی سائنس کی ترقی کا دروازہ کھول دیا۔ اسلام سے پہلے علم صرف پنڈتوں اور پادریوں کی جاگیر تھا۔ قرآن نے اس نور کو نورِ آفتاب کی طرح عام کر دیا۔ قرآن نے انسان کو ذہنی غلامی سے آزاد کیا: ﴿هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۞﴾ "لے آؤ سند اپنی اگر تم سچے ہو"۔ ساری دنیا بے

دلیل عقائد کی لعنت میں گرفتار تھی۔ قرآن نے مژدۂ جانفزا سنایا: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ﴾ یعنی جس بات کا علم نہ ہو اُس کی پیروی مت کرو!

تاریخ عالم میں پہلی مرتبہ قرآن نے کائنات میں غور وفکر کی دعوت دی۔ یہ پہلی اور آخری مذہبی کتاب ہے جس نے یہ کہا کہ اللہ کی ہستی کا ثبوت تمہارے اندر بھی ہے اور باہر بھی ہے: ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۵۳) ''عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی' یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہی بات حق ہے!'' اور جب قرآن حق ہے تو کوئی اس کا نازل کرنے والا بھی ہے اور وہ بھی حق ہے۔ عوام الناس کے لئے یہ دلیل دی: ﴿اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (ابراہیم:۱۰) ''کیا اللہ کی ہستی میں شک ہوسکتا ہے؟ وہی تو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے!''

قرآن دنیا میں پہلی مذہبی کتاب ہے جس نے صاحبانِ عقل وفہم وذکر وفکر کو کائنات میں تعقل' تفکر' تدبر اور تفقہ کی دعوت دی۔ قرآن کی عظمت کا اندازہ صرف مذاہبِ عالم کی مذہبی کتابوں کے تقابلی مطالعے سے ہوسکتا ہے۔ پاکستان میں سب کچھ ہے لیکن کسی یونیورسٹی میں مذاہبِ عالم کے تقابلی مطالعے کا کوئی شعبہ نہیں ہے۔

آیئے! عیسائیوں اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کی چند ابتدائی سطروں کا تقابلی مطالعہ کرلیں: ؎

خوش بود گر محکِ تجربہ آید بمیاں
تا سیہ روے شود ہر کہ در وغش باشد

(۱) رگ وید: اگنی میلے پروہتم رجنا سیادیوا رتی وجم' ہوتارم رتنا دھاتام

(۲) متی کی انجیل: خداوند یسوع مسیح کا نسب نامہ —— لیکن یہ تو خداوند کا شاگرد بیان کررہا ہے' خود خداوند نے ہمیں کیا پیغام دیا؟

﴿الٓمّٓ ۞ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۞ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ

بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۞ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۞ اُولٰئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۞

''الف' لام' میم ۔ یہ کتاب ہے جس (کے کلامِ الٰہی ہونے) میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لئے۔ جو کہ یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا اور قائم رکھتے ہیں نماز اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جو ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر بھی جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور ان کتابوں پر بھی جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں' اور آخرت کو وہ یقینی جانتے ہیں۔ وہی لوگ ہدایت پر ہیں اپنے پروردگار کی طرف سے اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

آغازِ ہی میں سب کچھ یا تمام ضروری سوالات کے جوابات دے دیئے اور یہ بھی بتا دیا کہ خیرِ اعلیٰ کیا ہے؟ لیکن نسب نامے سے کتاب یا صاحبِ کتاب کا تعارف نہیں ہوتا۔

اسی طرح توریت کا آغاز: براشیت بارا الوھیم ھا ارض و الشمائیم مگر اس سے کتاب کا تعارف نہیں ہوتا۔

نزولِ قرآن سے پہلے سائنس کا نام لینا بھی سارے مسیحی یورپ میں جرم تھا۔ راجر بیکن جب قرطبہ سے سائنس (طبیعیات' کیمیا اور حیاتیات) پڑھ کر انگلستان آیا تو انگریزوں نے اسے جادوگر کا لقب دیا۔ رومن کیتھولک کلیسا نے ہزاروں سائنس دانوں کو آگ میں زندہ جلا دیا۔ جلانے میں ''حکمت'' یہ تھی کہ اگر ایک جادوگر کا خون زمین پر گرے گا تو ''دھرتی ماتا'' ناپاک ہو جائے گی۔ صرف اسپین میں ۳۵ ہزار حکماء اور فلاسفہ کو زندہ جلا دیا گیا اور سارے یورپ میں کئی لاکھ بے گناہوں کو۔ اب رہا ہندوستان تو یہاں فلسفہ تو تھا مگر سائنس نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عوام الناس میں تمام عناصرِ فطرت سورج' چاند' ستارے' زمین' ہوا' افلاک' شفق' دریا' پہاڑ' حتیٰ کہ اعضائے جسمانی تک کی پرستش کی جاتی تھی' تو ان کے بارے میں مشاہدہ و تجربہ کیسے ہوتا؟ سورج اور آگ تو سب سے بڑے دیوتا تھے۔ قرآن اللہ کے نام سے شروع ہوتا

ہے رگ وید اگنی (آتش) کے نام سے شروع ہوتا ہے۔

یہ قرآن ہی تھا جس نے دنیا کو سب سے پہلے یہ بتایا کہ تمام عناصر فطرت تمہارے خادم ہیں اگنی پروہت اعظم نہیں ہے تمہاری خادمہ ہے:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ ۖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝﴾ (ابراهيم: ٣٣)

''اور مسخر کر دیا تمہارے لئے سورج اور چاند کو کہ لگا تار چلے جارہے ہیں اور مسخر کر دیا تمہارے لئے رات اور دن کو۔''

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ ﴾ (الحج: ٦٥)

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اس نے وہ سب کچھ تمہارے لئے مسخر کیا ہے جو زمین میں ہے؟''

پندرہ سے زائد آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ کائنات میں جو کچھ ہے تمہارے خادم ہیں مخدوم نہیں ہیں تمہارے مطیع ہیں فرمانبردار ہیں معبود یا مسجود نہیں ہیں۔ بے شک آج ہم اس انقلابِ ذہنی کا اندازہ نہیں کر سکتے جو قرآن نے آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں دنیا میں پیدا کر دیا۔

میرا دعویٰ ہے کہ قرآن کے سوا کسی مذہبی کتاب نے باطن (ذہن) اور خارج (عالمِ رنگ و بو) میں اتنا بڑا انقلاب پیدا نہیں کیا جتنا قرآن نے۔ اس محدود وقت اور مقالے میں تمام مذاہب سے مثالیں دینا تو ناممکن ہے میں صرف بودھ دھرم کو پیش کر کے اپنا دعویٰ ثابت کرتا ہوں:

۱) بودھ دھرم نے کہا خدا نہیں ہے۔ تو اس سے پہلے سانکھ درشن اور چارواک مت نے یہ تعلیم دی تھی۔ بودھ نے کیا انقلاب پیدا کیا؟

۲) بودھ دھرم نے کہا کہ آتما نہیں ہے تو چارواک نے اس سے پہلے یہ تعلیم دی تھی۔

۳) بودھ دھرم نے کہا کہ دنیا دکھ ہے تو ہر ہندو فلسفے اور اس سے پہلے جین دھرم نے یہ تعلیم دے دی تھی۔

۴) بودھ دھرم نے کہا کہ دنیا لائقِ ترک ہے' رہبانیت' تیاگ' ویراگ اور سنیاگ اختیار کرو' تو سارے ہندو اور جین یہی کہتے تھے۔ اور تو اور متھرا ازم' عیسائیت' مینکی ازم اور باطنیت سب کہتے تھے کہ مادّہ ناپاک ہے' جسم ناپاک ہے' دنیا ناپاک ہے' نکاح ناپاک ہے' عورت ناپاک ہے۔ کتنا بڑا انقلاب پیدا کیا قرآن نے کہ نہ مادّہ ناپاک ہے' نہ جسم ناپاک ہے' نہ عورت ناپاک ہے' نہ نکاح کرنا بری بات ہے۔

(ا) ذرا موازنہ تو کرو یسوعؑ کی تعلیم سے کہ ''مبارک وہ ہیں جو آسمانی بادشاہت کے لئے اپنے آپ کو خصی کرلیں اور عورت سے اجتناب کریں''۔

(ب) ذرا موازنہ تو کرو سدھارتھ گوتم بدھ کی تعلیم سے کہ: ''اگر عورت نظر آ جائے تو آنکھیں بند کرلو' وہ پاس آ جائے تو منہ پھیر لو' عورت سے بچو جس طرح سانپ سے بچتے ہو۔

(ج) موازنہ تو کرو جین دھرم سے کہ ''عورت چونکہ ہر وقت جیو ہتیا کرتی رہتی ہے اس لئے وہ کامل نجات حاصل نہیں کرسکتی۔ سورگ (جنت) کی چوبیس سیڑھیاں ہیں' وہ سولھویں ہی پر رہ جاتی ہے!''

اب دیکھو کہ قرآن نے عورت کو تحت الثریٰ سے اٹھا کر عزت کے آسمان پر پہنچا دیا۔ یہ زندگی کے صرف ایک شعبے میں انقلاب ہے۔ یقین کرو قرآن نے حیاتِ انفرادی اور حیاتِ اجتماعی کے ہر شعبہ میں انقلاب برپا کر دیا' اور خصوصاً اپنی حکیمانہ تعلیمات کی وجہ سے۔

قرآن پہلی کتاب ہے جس نے برہان کو کسی دعوے کی صحت کا معیار بنایا۔ اسلام سے پہلے دنیا کے تمام مذاہب برہان کے نام سے ناآشنا تھے۔ ہندومت' جین مت' بدھ مت' زرتشتیت' مینکی ازم' متھرا ازم' باطنیت' یہودیت اور عیسائیت' ان میں سے کسی مذہب نے مخالفین سے یہ نہیں کہا کہ: ﴿هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾' نہ یہ کہا کہ ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ﴾' نہ یہ کہا ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ اور نہ یہ کہا ﴿اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ﴾

قرآن دنیا میں پہلی اور آخری کتاب ہے جس نے عقل کی تسلی کا سامان مہیا فرمایا۔ (ا) دعویٰ کیا تو دلیل بھی دی' تاکہ عقل مطمئن ہو سکے اور آپ قبول کر سکیں (ب) حکم دیا تو اس کی لِم بتائی' تاکہ عقل مطمئن ہو سکے اور آپ عمل کر سکیں۔ مثلاً قرآن نے کہا خدا دو نہیں ہو سکتے تو اس پر برہان بھی پیش کی: ''لَفَسَدَتَا!'' قرآن نے حکم دیا روزہ رکھو تو لِم بھی بتا دی: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔

ایک بات اور عرض کر دوں' سارے قرآن کا اسلوبِ بیان منطقیانہ اور حکیمانہ ہے۔ اس کی قدر و قیمت یا خوبی کا اندازہ آپ کو اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ مذاہبِ عالم کی مزعومہ الہامی کتابوں کا بغور مطالعہ کر لیں۔ تُعْرَفُ الْاَشْيَاءُ بِاَضْدَادِهَا —— مسٹر بروہی نے مجھ سے کہا تھا دنیا ابھی تک آنحضرت ﷺ کی عظمت کا اندازہ نہیں کر سکی' کیونکہ انہیں کوئی یا سویل نہیں ملا۔ میں کہتا ہوں دنیا ابھی تک قرآن حکیم کی خوبیوں کا اندازہ نہیں کر سکی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ فرض ہم پر عائد ہوتا ہے لیکن ہم اللہ کے فضل سے تبلیغ و اشاعتِ قرآن کے بجائے قبروں کو گلاب اور روح کیوڑے کے عرق سے غسل دے رہے ہیں' یا کسی مشکل کشا کا دونا کھا رہے ہیں یا کسی دستگیر کی نیاز کھا رہے ہیں' یا غیر اللہ کو پکار رہے ہیں۔

اگرچہ قرآن نے عقل کو اس کا جائز مقام عطا فرمایا ہے اور ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم تعقل' تفکر' تدبر اور تفقہ سے کام لیں تاہم ایمان کا معیار عقل کے بجائے محبت کو رکھا ہے' کیونکہ عقل کا بنیادی تقاضا اطمینان عطا کرنا نہیں ہے بلکہ شبہات پیدا کرنا ہے۔ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ ایمان کی نشانی عقل و خرد نہیں ہے' بلکہ حبِ الٰہی ہے' اور یہیں آ کر ہندو دھرم اور اسلام میں موافقت ہو جاتی ہے۔ اگر مسلمان اپنے عہدِ حکومت میں اس حقیقت کو شائع کر دیتے تو اسلام سے ہندوؤں کی نفرت بڑی حد تک دور ہو جاتی اور وہ اسلام کے قریب آ جاتے۔ اکبر نے اسی حقیقت کو یوں واضح کیا ہے۔

مذہب کی لیپ پوت سے دبتی نہیں ہے عقل
بس عشق ہی مٹاتا ہے اس کی کرید کو

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے اور علمِ قلیل کبھی غیر محدود کا ادراک نہیں کرسکتا' اس کا ذریعہ عشق ہے۔

انسان میں بنیادی faculties عشق اور عقل ہیں۔ قرآن نے دونوں کی اہمیت تسلیم کی ہے اور فرمایا ہے کہ:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾

(آل عمران: ۱۹۰'۱۹۱)

اللہ کا ذکر کرو' کائنات میں فکر کرو! یہ ہے صحیح طریق کار۔ مگر تیسری اور چوتھی صدی سے منافقین نے اصحاب العدل والتوحید کا نقاب پہن کر قرآنی طریق کو الٹا کر دیا۔ اس دشمنِ اسلام جماعت نے اللہ کی ذات میں فکر شروع کیا اور کائنات کا ذکر یعنی دنیا سے محبت کا درس دیا۔ یعنی وہ بحثیں شروع کیں جن کا قرآن میں کہیں ذکر نہیں ہے۔ مثلاً ذاتِ باری تعالیٰ اور وجودِ باری تعالیٰ میں کیا فرق ہے؟ کیا خدا پر شے کا اطلاق ہوسکتا ہے؟ صفات کا ذاتِ باری تعالیٰ سے کیا رشتہ ہے؟ آیا وہ عینِ ذات ہیں یا غیر ذات ہیں؟ یا لاعین ولا غیر ہیں؟ یا زائد علی الذات ہیں؟ یا علاقہ فیما بین نا قابلِ تشریح ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں کہ ان کا تسلی بخش جواب نہ ہوا ہے نہ ہوسکتا ہے۔ کیونکہ یہ سب سوالات وراء العقل ہیں۔ عقل تو مادیات میں چل سکتی ہے' جو ذات لامحدود اور ابدی ہے' اس میں وہ سراسر عاجز ہے۔ بقول اکبر۔

انکشافِ رازِ ہستی عقل کے بس میں نہیں
فلسفی یاں کیا کرے اور سارا عالم کیا کرے!

اور۔

چلتی نہیں کچھ اپنی کوئی ہزار چاہے
ہوتا ہے بس وہی جو پروردگار چاہے!

بہر حال عقل کو قرآن نے اس کا جائز مقام عطا کیا ہے' اس کی مذمت نہیں کی بلکہ اسے استعمال کرنے کا حکم دیا ہے۔ تعقل' تفکر' تدبر اور تفقہ کی تلقین کی ہے لیکن اسے اس کی حد میں رکھنے کا بھی حکم دیا ہے۔ جب عقل مادیات میں کامل رہنما نہیں ہے' وہ نفسِ ناطقہ کی ماہیت نہیں سمجھ سکتی (اس لئے انکار کر دیتی ہے) تو خدا کی ماہیت کیسے سمجھ سکتی ہے؟ بقول اکبر۔

عقلِ انساں کیوں نہ عاجز ہو ترے ادراک میں
روح ہی کو یہ نہ سمجھی اور تُو ہے جانِ روح!

فلسفہ لاکھ کوشش کرے حقیقت سے واقف نہیں ہو سکتا' صرف مظاہر سے بحث کر سکتا ہے۔ کانٹ کا سارا فلسفہ ہی یہ ہے کہ ہمیں صرف مظاہر کا علم حاصل ہو سکتا ہے' حقیقت کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔

کچھ نہیں کارِ فلک حادثہ پاشی کے سوا
فلسفہ کچھ نہیں الفاظ تراشی کے سوا!

ہیوم کہتا ہے کہ ہمیں نفسِ ناطقہ کا ادراک نہیں ہو سکتا' صرف impressions اور ideas کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔

خلاصۂ کلام اینکہ قرآن سراپا حکمت ہے' اس لئے اس نے حکمت' عقل و خرد اور فلسفے کو مردود قرار نہیں دیا' ہاں ان کو جائز حدود میں رکھا ہے۔ کیونکہ حقیقت کا ادراک وراء العقل ہے۔

فلسفی بھی نوحہ گر ہیں ذہن کے مقسوم پر
رکھتے ہیں معلوم کی بنیاد نامعلوم پر!

مثلاً اشیائے مادّی کی اصل برق پارے ہیں اور اُن کی اصل نامعلوم ہے۔

۱) شخصیتِ انسانی کے تین پہلو ہیں۔ علم' جذبات اور ارادہ۔ تو علمی پہلو کی نشوونما کے لئے قرآن نے غور و فکر' مشاہدے اور تجربے کا حکم دیا۔ جذباتی پہلو کی نشوونما کے لئے اللہ سے محبت کا حکم دیا' کیونکہ

عشقِ آں زندہ گزیں کو باقی است
و ز شرابِ جاں فزایت ساقی است

ارادی یا عملی پہلو کی تربیت کے لئے جہاد فی سبیل اللہ اور انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا!!

۲) انسان میں دو قوتیں یعنی faculties ہیں' ذکر اور فکر' دونوں کے وظیفے مقرر کر دیئے!

۳) اپنے تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ اگرچہ قرآن فلسفے کی درسی کتاب نہیں ہے' لیکن اگر کوئی شخص اس کتاب کو سمجھ کر روح کی گہرائیوں میں اتار لے تو بفضلِ خدا بہت بڑا فلسفی بن جائے گا۔ آزمائش شرط ہے ع

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشتی

استدراک

میری رائے میں قرآن کا اصلی اور بنیادی مقصد تو خدارسی' ادراکِ ذات یا تحصیل و تحقیق ذات ہے اور اس کا ذریعہ تزکیۂ نفس ہے' جو اِس زمانے میں پوری مسلمان قوم کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے خارج ہو چکا ہے۔ بلکہ بعض اسلامی جماعتیں اسے عجمی سازش اور افیون سے تعبیر کرتی ہیں۔ یعنی اپنے قلب کی گہرائیوں میں اللہ تعالیٰ کی موجودگی کا احساس کرنا۔

اقبالؔ کی رائے میں قرآن کا اصلی مقصد یہ ہے کہ انسان کے دل میں کائنات اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسان کے گوناگوں تعلقات کا شعور اجاگر کیا جائے۔ لیکن یہ قرآن مجید نوعِ انسانی کے لئے پیامِ آخریں بھی ہے اس لئے اس میں سب کچھ موجود ہے' سیاست اور معیشت بھی ہے حکمت اور فلسفہ بھی' تردید شرک بھی ہے اثباتِ توحید بھی' ضابطۂ اخلاق بھی ہے اور قانونِ جنگ و صلح بھی۔

قرآن کو قرآن حکیم اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں از اوّل تا آخر حکیمانہ نکتے بیان کئے گئے ہیں اور خود قرآن نے حکمت کو ''خیر کثیر'' کہا ہے:

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ

وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (البقرة:۲۶۹)

''جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے' اور جس کو حکمت ملی اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی۔ ان باتوں سے وہی سبق لیتے ہیں جو دانشمند ہیں۔''

دنیا کی موجودہ مذہبی کتابوں میں صرف قرآن حکیم ہی وہ واحد یا تنہا کتاب ہے جو بہت سی خصوصیات کی حامل ہے۔ اس موضوع پر مَیں نے ۱۹۳۸ء میں ۶۴ صفحات کا مقالہ لکھ دیا تھا۔ چنانچہ ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس عدیم المثال کتاب نے مصطلحاتِ فنون استعمال نہیں کی ہیں۔ میری رائے میں اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ پھر یہ کتاب ذکر کے لئے آسان نہ رہتی۔ اس کے باوجود مختلف علوم وفنون کے حقائق بیان کر دیئے ہیں۔ مثلاً فلسفے میں ایک بحث یہ ہے کہ قدیم ایک سے زیادہ ہوسکتا ہے یا نہیں۔ قرآنِ حکیم نے فیصلہ صادر فرمایا کہ قدیم یا واجب الوجود صرف ایک ہوسکتا ہے' ماسوی اللہ حادث یا ممکن الوجود ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ﴾ (فاطر:۱۵)

اب یہاں قرآن نے ممکن یا حادث کے بجائے فقیر یا محتاج کا لفظ استعمال کیا ہے اور واجب یا قدیم کے بجائے "الغنی الحمید" کی ترکیب استعمال فرمائی ہے۔ اسی طرح الوہیتِ مسیح کی تردید فرمائی تو یہ طریقہ استعمال کیا:

﴿مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۭ﴾ (المائدۃ:۷۵)

''مسیح ابن مریم اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول تھا' اس سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے۔ اس کی ماں راست باز تھی' اور وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔''

پہلا قضیہ: خدا جسم نہیں' مادہ نہیں۔ غیر مجسم کھانا نہیں کھاتا' اس لئے خدا کھانا نہیں کھاتا۔
دوسرا قضیہ: خدا کھانا نہیں کھایا کرتا' مسیح کھاتے تھے اس لئے مسیح خدا نہیں ہوسکتے۔ یہ باتیں منطقی ہیں مگر اندازِ بیان آسان ہے۔

منافقانہ اعمال

مدرس: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو (رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: ((اَرْبَعٌ مَنْ کُنَّ فِیْہِ کَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ کَانَتْ فِیْہِ خَصْلَۃٌ مِنْھُنَّ کَانَتْ فِیْہِ خَصْلَۃٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰی یَدَعَھَا: اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَاِذَا عَاھَدَ غَدَرَ وَ اِذَا خَاصَمَ فَجَرَ)) (متفق علیہ)

''حضرت عبداللہ بن عمرو (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''چار عادتیں ایسی ہیں کہ جس کسی میں وہ چاروں جمع ہو جائیں تو وہ خالص منافق ہے' اور جس میں اُن چاروں میں سے کوئی ایک خصلت ہو تو اُس کا حال یہ ہے کہ اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے' (اور وہ اسی حال میں رہے گا) جب تک کہ اس عادت کو چھوڑ نہ دے (وہ چاروں عادتیں یہ ہیں): جب اُس کو کسی امانت کا امین بنایا جائے تو اُس میں خیانت کرے' اور جب باتیں کرے تو جھوٹ بولے' اور جب عہد معاہدہ کرے تو اُس کی خلاف ورزی کرے اور جب کسی سے جھگڑا اور اختلاف کرے تو بدزبانی کرے''۔

اس حدیث میں منافق کی علامات بتائی گئی ہیں کہ وہ امانت میں خیانت کرتا ہے' بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے' جب عہد کرتا ہے تو خلاف ورزی کرتا ہے اور جب جھگڑا کرتا ہے تو بدزبانی پر اتر آتا ہے۔

جب ہم منافقت کا لفظ سنتے ہیں تو ذہن فوراً منافقینِ مدینہ کی طرف پلٹ جاتا ہے جن کا سردار عبداللہ بن اُبی تھا۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے مدینہ میں مہاجرین کا آنا

پسند نہ کیا اور نہ ہی انصار کا قبولِ اسلام انہیں گوارا تھا' مگر اُن میں مسلمانوں کی مخالفت کی ہمت بھی نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے بظاہر اسلام قبول کر لیا مگر دل سے کافر ہی رہے۔ اس طرح وہ مسلمانوں کے ساتھ بیٹھتے اُٹھتے' اسلامی عبادات بجالاتے' یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھی ان کو مسلمان ہی سمجھتے۔ مگر وہ اندر ہی اندر اسلام کی مخالفت اور مسلمانوں کی بدخواہی کے منصوبے بناتے رہتے۔ جب کبھی ان کے کردار و عمل سے منافقت ظاہر ہوتی تو طرح طرح کے بہانے بنا کر' قسمیں کھا کر اور جھوٹ بول کر اپنے ایمان اور اسلام کا یقین دلاتے۔ لیکن یہ منافقین کی وہ قسم ہے جنہیں ہم اعتقادی منافق کہتے ہیں۔ جبکہ اس حدیث میں منافقین کی اس دوسری قسم کا تذکرہ ہے جو اعتقادی منافق تو نہیں مگر اُن کے اعمال منافقین جیسے ہیں' اگرچہ وہ توحید و رسالت کا اقرار کرتے ہیں' اسلام کو سچا دین سمجھتے ہیں اور قانون کی نگاہ میں مسلمان شمار ہوتے ہیں۔ اسلامی معاشرے میں بھی انہیں مسلمان سمجھا جاتا ہے اور انہیں ہر طرح کے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ ایسے مسلمان عقیدے کے طور پر تو مسلمان ہیں مگر عملی طور پر منافق ہیں۔ اس حدیث میں ایسے ہی منافقین کی علامات بتائی گئی ہیں۔

''نَفَقَ'' عربی کا لفظ ہے' جس کا ایک معنی جنگلی چوہے کا اپنے بل میں آنا جانا ہے' جبکہ اس کے بل کو 'نَافِقَاء'' کہا جاتا ہے۔ یہ بل زمین کے اندر ہی اندر ایسی سرنگ ہوتی ہے جس کے دونوں سرے کھلے ہوتے ہیں تاکہ اگر ایک طرف سے حملہ ہو تو جنگلی چوہا دوسرے راستے سے بھاگ نکلے اور جان بچانے میں کامیاب ہو جائے۔ اسی سے لفظ ''نفاق'' بنا ہے۔ اس طرح منافقت وہ طرزِ عمل ہے جس میں اپنا بچاؤ پیشِ نظر رہے اور ذمہ داریاں اور فرائض پورے نہ کرنے پڑیں۔ اعتقادی منافق بھی مسلمانوں کی زد سے بچنے کے لئے اسلام کا دعویٰ کرتے تھے' لیکن جب انفاق فی سبیل اللہ یا جہاد کا موقع آتا تو بہر طور اسے ٹالنے کی کوشش کرتے اور کئی طرح کے بہانے تراشتے تھے۔ پس ایسا مسلمان بھی عملی طور پر منافق ہے جس کا کردار و عمل اسلامی اخلاق کے مطابق نہ ہو۔ چنانچہ اس حدیث میں چار ایسے خصائل کا ذکر کیا گیا ہے جو کسی مسلمان اور مؤمن کے

شایانِ شان نہیں اور اُن کو اختیار کرنے والا بھی منافق سمجھا گیا ہے۔

منافقت کے ان خصائل میں سے پہلی خصلت حضور اکرم ﷺ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ امانت میں خیانت کرتا ہے۔ جبکہ مسلمان تو وہ ہے کہ اگر اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ اس امانت کی پوری طرح دیکھ بھال اور حفاظت کرے اور جب مالک امانت واپس مانگے تو بلا حیل و حجت واپس کر دے۔ اگر کوئی مسلمان دوسرے کے مال میں خیانت کرتا ہے تو گویا وہ حقوق العباد کی اہمیت سے غافل ہے' وہ اس بات سے بے خبر ہے کہ امانت میں خیانت کے متعلق جواب دہی کرنا ہوگی۔ مال کی خیانت تو دُور کی بات ہے اسلام تو یہ کہتا ہے کہ اگر کسی نے آپ سے رازدارانہ انداز میں مشورہ کیا ہے تو وہ بھی آپ کے پاس امانت ہے' اس شخص کے راز کو افشا کرنا بھی امانت میں خیانت ہے۔ پس جو مسلمان امانت کے معاملے میں احتیاط نہیں کرتا حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق وہ ایک چوتھائی منافق ہے۔

منافقت کی دوسری علامت جھوٹ بولنا بتایا گیا ہے۔ جھوٹ کبیرہ گناہ ہے۔ اس سے اجتناب کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ جھوٹ خلافِ حقیقت بات کرنے کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے جھوٹ میں بھی دراصل اپنا مفاد محفوظ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ جھوٹ بول کر اور جھوٹی قسمیں کھا کر دوسرے شخص کو مطمئن کیا جاتا ہے اور اپنا مفاد حاصل کر لیا جاتا ہے۔ مگر یہ بات بھی مسلمان کے شایانِ شان نہیں کہ وہ دوسروں کے نقصان کی پروانہ کرے بلکہ اپنا مفاد ہمہ وقت اس کے پیش نظر ہو۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس کے جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے ایک میل دُور چلا جاتا ہے۔ (جامع ترمذی) جھوٹ بہر حال جھوٹ ہے۔ خلافِ واقعہ کہی ہوئی ہر بات جھوٹ ہے۔ اسی لئے کسی معاملے کو بیان کرتے ہوئے افراط و تفریط سے بچنا ضروری ہے۔ رپورٹنگ میں احتیاط نہایت ضروری ہے' کیونکہ اگر کوئی چیز حقیقت کے خلاف کہہ دی تو وہ جھوٹ ہو جائے گا۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ مؤمن کی طبیعت اور فطرت میں ہر خصلت کی گنجائش ہے سوائے خیانت اور جھوٹ کے۔ (مسند احمد و

شعب الایمان للبیہقی) جھوٹ بولنے کی ہلاکت کا ذکر کرتے ہوئے آپ ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اسے بیان کرتا پھرے۔ (صحیح مسلم) پس سنی سنائی بات کو بلاتحقیق آگے بیان کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے مبادا وہ بات غلط ہو اور انسان جھوٹ کا ارتکاب کر بیٹھے۔

جھوٹ بولنا اس قدر بُری بات ہے کہ اسلامی تعلیمات میں بچوں کے ساتھ بھی جھوٹ بولنے کی ممانعت ہے۔ ایک ماں نے بچے کو پکارا کہ میرے پاس آمیں تجھے ایک چیز دوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بچے کو کیا دو گی؟'' ماں نے کہا میں نے ایک کھجور دینے کا ارادہ کیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''یاد رکھو! یہ بات کہنے کے بعد اگر تم بچے کو کوئی چیز بھی نہ دیتیں تو تمہارے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھا جاتا''۔ (سنن ابی داؤد) اسی طرح آپ ﷺ نے ہنسنے ہنسانے کے لئے جھوٹ بولنے سے بھی منع کیا ہے' حتیٰ کہ جانوروں کو جھوٹا لالچ دینے سے روکا گیا ہے۔ پس آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق جھوٹ بولنا بھی منافقت کی علامت' بلکہ ایک چوتھائی نفاق ہے۔

منافقت کی تیسری علامت عہد کا پورا نہ کرنا ہے۔ کسی شخص کے ساتھ وعدہ کیا جائے تو وہ شخص انتظار میں رہتا ہے اور جب وعدہ پورا نہ کیا جائے تو اسے پریشانی لاحق ہوتی ہے اور اکثر اوقات اسے نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پس دوسروں کو پریشان کرنا یا اُن کا نقصان کرنا کسی مسلمان کا شیوہ نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے ایک حدیث میں عہد شکنی کو دین کے منافی کہا گیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو خطبہ دیا ہو اور اس میں یہ نہ فرمایا ہو کہ ''جس میں امانت کی خصلت نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس میں عہد کی پابندی نہیں اس میں دین نہیں''۔ (شعب الایمان للبیہقی)

عہد کیا ہے؟ یہ وہ اقرار ہے جو فریقین کے درمیان طے پاتا ہے اور ہر فریق اُس کی پابندی کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ غور کریں تو ہم طرح طرح کے معاہدوں کے

درمیان ہیں۔ ملازم ہے تو وہ شرائط ملازمت کے مطابق کام کرنے کا پابند ہے اور مالک اس کو تنخواہ دینے کا پابند ہے۔ اسی طرح مزدور اور کارخانہ دار' گاہک اور دکاندار میں سے ہر ایک معاہدے کے مطابق اپنا فرض ادا کرنے کا پابند ہے۔ معلوم ہوا کہ حقوق العباد کا زیادہ حصہ انہی معاہدوں پر مشتمل ہے اور حقوق العباد کی ادائیگی پر اسلام میں بہت زور دیا گیا ہے۔ اگر ہر شخص اپنے فرائض کی ادائیگی میں مستعد ہو تو معاشرہ جنت نظیر بن جائے۔ یہ حقوق کی تلفی ہی ہے جو جھگڑے اور فساد پیدا کرتی ہے۔

عہد کی پابندی کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا اُسوۂ حسنہ دیکھنا ہو تو وہ واقعہ یاد کیجئے جب آپؐ نے عبداللہ بن ابی الحمساء کے ساتھ وعدہ کرلیا کہ تم آجاؤ میں یہاں تمہارا انتظار کروں گا' مگر وہ جا کر بھول گئے' رسول اللہ ﷺ ایفائے عہد کی خاطر وہیں کھڑے اس کا انتظار کرتے رہے۔ جب عبداللہ تین دن کے بعد وہاں آئے تو دیکھا کہ حضور ﷺ اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ عبداللہ کو دیکھ کر آپؐ نے فرمایا: ''تم نے مجھے بڑی مشکل میں ڈالا اور بڑی زحمت دی' میں تمہارے انتظار میں تین دن سے یہیں ہوں''۔ (سنن ابی داؤد) یاد رہے کہ یہ واقعہ قبل از نبوت کا ہے۔ گویا نبوت ملنے سے پہلے بھی آپ ﷺ کا کردار اس قدر بلند تھا کہ آپؐ نے اتنی مشقت برداشت کر لی لیکن عہد کی خلاف ورزی نہیں کی۔ پس ایک مسلمان کو ہرگز یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ وعدہ خلافی کرے۔ یوں وعدہ خلافی بھی منافقت کی ایک علامت ہوئی۔

منافقت کی چوتھی علامت اس حدیث میں یہ بتائی گئی ہے کہ کوئی شخص بحث وتمحیص اور اختلافی جدال کی صورت میں بدزبانی اور گالی گلوچ پر اتر آئے۔ اسلام ہمیں اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے جہاں بدکلامی کی بالکل گنجائش نہیں۔ زبان کے استعمال میں نہایت احتیاط ملحوظ رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ کسی کے ساتھ اختلافی معاملہ پر گفتگو یا بحث وتمحیص کے موقع پر دلائل اور براہین کی قوت استعمال کرنا چاہئے اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہئے۔ اگر فریق مخالف میں کج فہمی اور ضد دیکھی جائے اور دلائل بے اثر نظر آئیں تو ایسے موقع پر ﴿اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا﴾ کے انداز میں

بحث کو ختم کر کے اپنی راہ لینی چاہئے۔ ایسے موقع پر مخالف کی تیز و تند باتوں پر اسی انداز میں ردِّ عمل ظاہر کرنا ہرگز مفید نہیں رہتا۔ اس سلسلہ میں اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ اپنے مخالف کی طرف سے برائی ہو تو اس کا جواب نیکی اور بھلائی کے ساتھ دیا جائے۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ دشمن بھی گہرا دوست بن جائے گا۔

ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''پہلوان اور طاقتور وہ نہیں جو مدمقابل کو پچھاڑ دے' بلکہ پہلوان اور شہ زور درحقیقت وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے''۔ (بخاری و مسلم) مخالفانہ ضد میں غصہ تو آتا ہے مگر ہمیں غصہ سے مغلوب ہو کر شرافت اور متانت کا دامن چھوڑنے کی اجازت نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''غصہ شیطان کے اثر سے آتا ہے اور شیطان آگ سے پیدا ہوا ہے اور آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے' لہٰذا جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اس کو چاہئے کہ وضو کر لے''۔ (سنن ابی داؤد) پس زبان کے واہی تباہی اور بے باکانہ استعمال سے گریز کرتے ہوئے عالی ظرفی کا ثبوت دینا ہی مسلمان کے شایانِ شان ہے۔ زبان کا غلط استعمال تو نری ہلاکت ہے۔ حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ میرے بارے میں آپؐ کو جن باتوں کا خطرہ ہے ان میں زیادہ خوفناک کون سی چیز ہے؟ آپؐ نے اپنی زبان مبارک پکڑ کر فرمایا: ''سب سے زیادہ خطرہ اس سے ہے''۔ (ترمذی) زبان کے غلط استعمال سے جو شخص رک گیا یوں سمجھئے کہ وہ بڑی حد تک گناہوں سے بچ گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا: ''جو چپ رہا وہ نجات پا گیا''۔ (مسند احمد' ترمذی)

پس اس حدیث سے سبق حاصل کرتے ہوئے ان چاروں منافقانہ اعمال سے ہر طور اجتناب کرنا چاہئے۔ منافقت بہت بُرا طرزِ عمل ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ ''ضرور بالضرور یہ منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ڈالے جائیں گے''۔

اسلام اور سائنس

مذہب، فلسفے اور سائنس کے تطابق کی روشنی میں

زندگی کا ظہور و ارتقاء (۲)

تحریر: سید قاسم محمود

زندگی کے ظہور و آغاز کے بارے میں عام طور پر چار نظریے پیش کئے جاتے ہیں، جن کی وضاحت اختصار کے ساتھ یوں ہے:

(۱) نظریۂ تخلیق ربّانی (Divine Creation)

اس نظریے کے مطابق زندگی کی تخلیق ایک فوق الفطرت ہستی یعنی اللہ تعالیٰ نے کی، جو قادرِ مطلق ہے۔ وہ ہر شے پیدا کرنے پر قادر ہے، وہ واحد ہے، بے نیاز ہے، نہ اس سے کوئی پیدا ہوا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔ وہ غیب و شہود کا جاننے والا ہے۔ اسی نے کائنات بھی تخلیق کی اور زندگی بھی۔ ''تخلیق'' سے مراد نیست سے ہست میں اور عدم سے وجود میں لانا ہے۔ گویا زندگی سے پہلے نیستی کا عالم تھا، پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے یکا یک ہستی کا عالم چھا گیا۔

قرآن مجید کی متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ کی اس قدرتِ کاملہ کا بیان ''کُنْ فَیَکُوْنُ'' کی صورت میں ہوا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۱۷ میں ہے: ﴿وَاِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ ''وہ جس کام کو کرنا چاہے، پس کہہ دیتا ہے کہ ہو جا، پس وہ وہیں ہو جاتا ہے''۔ سورۂ آل عمران (آیات ۴۷ اور ۵۹)، سورۃ الانعام (آیت ۷۳)، سورۂ یٰسین (آیت ۸۲) اور سورۃ المؤمن (آیت ۶۸)

'کُنْ' (ہو جا) اور فَیَکُوْنُ' (اسی وقت ہو جانا) سے تخلیق ربانی کے نظریے کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس نظریے کے مطابق اللہ تعالیٰ نے پہلے کائنات پیدا کی۔ سب سے پہلے جمادات کو پیدا کیا اور جمادات کی تکمیل کے بعد بے جان مادے میں زندگی کی روح پھونکی۔ نیز یہ کہ اللہ نے سب سے پہلے ایک ایک جاندار الگ الگ پیدا کیا' جس نے بعد میں اپنی اپنی نسل کو برقرار رکھا اور یہ سلسلۂ تولید اب تک جاری و ساری ہے۔ اس سلسلے میں بائبل کی کتاب ''پیدائش'' میں بیان کردہ کہانی خاص طور پر لائق توجہ ہے۔ اسے ''کہانی'' اس لئے کہا گیا ہے کہ جدید سائنسی تحقیق کی روشنی میں یہ باتیں غلط محسوس ہوتی ہیں اور صاف طور پر نظر آتا ہے کہ کسی شخص یا اشخاص نے اپنے عہد کے افکار و خیالات کلامِ الٰہی میں داخل کر دیئے ہیں۔ فاضل محقق ڈاکٹر مورس بوکائیے نے اپنی مشہور تصنیف ''بائبل' قرآن اور سائنس'' (اردو ترجمہ ثناء الحق صدیقی) میں بائبل کے بیان کو کہانی ثابت کرنے کے بعد' زندگی کی ابتدا کے بارے میں قرآن مجید سے استدلال کیا ہے۔

ڈاکٹر مورس لکھتے ہیں: ''زندگی کی ابتدا کیونکر ہوئی؟ اس سوال نے انسان کو ہمیشہ سے اُلجھن میں ڈال رکھا ہے' جبکہ قرآن کریم نے اس مسئلے کو انتہائی آسان اور مختصر کر رکھا ہے۔ اس ضمن میں آیاتِ قرآنی بے شمار ہیں' لیکن یہاں صرف ایک آیت کا حوالہ دینا کافی ہے' جس میں زندگی کے آغاز کے علاوہ کائنات اور زمین کی ابتدا کا ذکر بھی آ گیا ہے۔

پانی سے پیدائش:

سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۰ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا ؕ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ﴾

''کیا وہ لوگ جنہوں نے (نبی کریم ﷺ کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے'

غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے؟ پھر ہم نے اِن کو جدا کیا اور ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا۔ کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے؟''

آیت میں کوئی ابہام نہیں' مفہوم واضح ہے کہ ہر زندہ چیز پانی سے بنائی گئی ہے۔ سورۃ النور کی آیت ۴۵ میں بھی یہی فرمایا گیا:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ۚ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾

''تمام کے تمام چلنے پھرنے والے جانداروں کو اللہ تعالیٰ نے پانی سے پیدا کیا ہے۔ ان میں سے بعض تو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں (جس طرح سانپ' مچھلی' کیڑے مکوڑے اور دیگر حشرات الارض ہیں) بعض دو پاؤں پر چلتے ہیں (جیسے انسان اور پرند)' بعض چار پاؤں پر چلتے ہیں (جیسے تمام چوپائے اور دیگر حیوانات)۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے''۔

ہر زندہ چیز پانی سے بنائی گئی یا ہر زندہ چیز کی ابتدا پانی میں ہوئی' دونوں امکانی مفہوم سائنس سے مطابقت رکھتے ہیں۔ زندگی کی ابتدا پانی سے ہوئی' یعنی پانی تمام جاندار خلیوں کا جزِ اعظم ہے۔ پانی کے بغیر زندگی ممکن نہیں ہے۔ پانی زندگی کا باپ ہے اور ماں بھی۔ چنانچہ جب کسی دوسرے سیارے (مثلاً مریخ) پر زندگی کے امکان پر بحث کی جاتی ہے تو پہلا سوال ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ کیا وہاں زندگی کو قائم رکھنے کے لئے کافی پانی موجود ہے؟

آیاتِ قرآنی کے جس لفظ کا ترجمہ پانی کیا گیا ہے' وہ ''مَاءٌ'' ہے۔ یہ ایک جامع لفظ ہے۔ اس سے مراد اگر بارش اور چشموں اور دریا و سمندر کا پانی ہے تب بھی واضح ہے کہ اس سے روئیدگی ہوتی ہے اور ہر ذی روح کو حیاتِ نو ملتی ہے۔ اور اگر مراد نطفہ ہے تو اس میں بھی کوئی اشکال نہیں کہ ہر زندہ چیز کے وجود کا باعث وہ قطرۂ آب ہے جو

نَر کے صلب سے نکلتا اور مادہ کے رحم میں جا کر قرار پکڑتا ہے۔

ڈاکٹر مورس بوکائیے اس بحث کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں: ''لہٰذا پانی سے خواہ زندگی کی ابتداء وظہور سے بحث کی جائے یا وہ عنصر مراد ہو جو پودوں کو مٹی میں جنم دیتا ہے یا حیوانات کا تخم اور آدمی کا نطفہ سمجھا جائے' زندگی کے آغاز کے بارے میں تمام قرآنی بیانات جدید سائنسی معلومات سے مکمل مطابقت رکھتے ہیں۔ زندگی کے ظہور سے متعلق جو اساطیر' نظریے اور کہانیاں نزولِ قرآن کے وقت عام طور پر دنیا بھر میں رائج تھیں' اُن میں سے کوئی بھی قرآن حکیم کے متن میں مذکور نہیں ہیں۔''

پاکستان کے فاضل دانشور جناب احمد افضال اپنے مقالے ''زندگی کی ابتدا'' مطبوعہ ماہنامہ ''سائنس میگزین'' دسمبر ۱۹۸۵ء میں ڈاکٹر مورس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام بھی ''راست تخلیق'' کا قائل اور ارتقاء کے خلاف ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ وجودِ باری تعالیٰ (اور اس کی توحید) کو تسلیم کر لینے کے بعد ارتقاء کا مسئلہ ہو یا زندگی کی براہِ راست پیدائش کا سوال' کفر و ایمان کا مسئلہ نہیں' بلکہ صرف ایک فکری اور اجتہادی معاملہ رہ جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں بعض ایسے واضح اشارے ملتے ہیں جو ایک غالب وحکیم وعلیم وقادر اللہ کے زیرِ نگرانی ہونے والے ارتقاء کی نشان دہی کرتے ہیں۔ چونکہ قرآن سائنس کی کتاب نہیں ہے' اس لئے یہ اشارے خاصے مجمل ہیں اور جدید سے جدید معلومات کی روشنی میں ان کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات اللہ کا فعل ہے اور قرآن اس کا قول ہے۔ یوں مذہب اور سائنس یا قرآن اور عقل میں باہم کوئی تضاد یا تصادم نہیں ہے''۔

(۲) نظریۂ از خود تولید (Spontaneous Creation)

اس نظریے کے مطابق زندگی بے جان مادے سے خود بخود پیدا ہوئی' زندگی کا کوئی خالق نہیں ہے' یہ اپنی خالق آپ ہے۔ یہ نظریہ سب سے پہلے یونانی فلسفی انکسامندر نے ۶۰۰ قبل مسیح میں پیش کیا تھا' جسے ارسطو نے آگے بڑھایا۔ ارسطو کے

زمانے سے لے کر سترہویں صدی کے وسط تک یہی خیال کیا جاتا تھا کہ کیڑے مکوڑے' مینڈک' گھونگے' کیچوے' جونکیں اور دیگر تمام ایسی زندہ موجودات جو ہم گندگیوں' جوہڑوں' دلدلوں' کھڑے پانیوں' بدرروؤں اور گندے غلیظ مادوں میں دیکھتے ہیں' یہ سب خود بخود تولید پاتے ہیں۔

یورپ میں سترہویں صدی میں نشاۃِ ثانیہ اور احیائے علوم کی تحریک چلی اور علم و عقل کا شہرہ ہوا تو اس گمراہ کن نظریے کے خلاف بھی آوازیں اٹھنا شروع ہوئیں۔ تاہم ان آوازوں کے پیچھے تجربے کی گواہی نہ تھی۔ جب ماہرین حیاتیات نے از خود پیدا ہونے والے موجودات پر تحقیق کی تو بہت سے تجربات کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کوئی زندہ چیز خود بخود وجود میں نہیں آتی' بلکہ ایک اور زندہ چیز سے تولید پاتی ہے۔

پہلی بار اٹلی کے مشہور کیمیا دان فرانسسکو ریڈی نے ۱۶۶۸ء میں ''بے جان سے جاندار'' مفروضے کی صحت کا امتحان لینے کے لئے چند سادہ سے تجربات کئے۔ اس نے شیشے کے تین مرتبانوں میں گوشت رکھا۔ ایک مرتبان کھلا رکھا' دوسرے کے مُنہ پر بہت باریک کپڑے کی جالی ڈالی اور تیسرے پر چمڑے کی دبیز جھلی منڈھ دی۔ کھلے مُنہ کے مرتبان کے گوشت میں مکھیوں نے انڈے دیئے۔ یہ انڈے مناسب وقت پر باقاعدہ مکھیاں بن گئے۔ باریک جالی سے ڈھکے ہوئے مرتبان کے اندر سے کیونکہ گوشت کی بو آ رہی تھی' اس لئے مکھیوں نے مرتبان کی اوپر کی سطح پر انڈے دیئے' لیکن یہ انڈے غذا کی بہم رسانی نہ ہونے کے باعث مکھیاں نہ بن سکے۔ تیسرے مرتبان سے چونکہ گوشت کی بو بھی نہیں آ رہی تھی' اس لئے مکھیوں نے مرتبان کی بیرونی سطح پر انڈے نہیں دیئے۔ ریڈی کے ان تجربات سے ظاہر ہوا کہ گوشت میں جو کیڑے پیدا ہوتے ہیں وہ ان کیڑوں کے انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں جو اُس میں مکھیوں کے ذریعے منتقل ہوتے ہیں۔ ریڈی کے اس واضح تجربے کے باوجود عام لوگوں کا یہی خیال رہا کہ جراثیم (بیکٹیریا) بے جان مادے سے پیدا ہوتے ہیں۔

بالآخر انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں فرانس کا کیمیا دان لوئی پاسچر اس قابل

ہوا کہ اس امر کو پایۂ ثبوت تک پہنچائے اور اس پر قطعی اور فیصلہ کن دلائل و شواہد پیش کرے کہ از خود تولید کا نظریہ غلط ہے' کیونکہ کوئی بھی شے خود بخود پیدا نہیں ہو سکتی' بلکہ ہر زندہ موجود ایک دوسرے زندہ موجود ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ دودھ خراب نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں زندہ موجودات کے جراثیم شامل نہ ہونے دیئے جائیں۔ اس امر کی بہترین مثال لوئی پاسچر کی لیبارٹری میں محفوظ وہ یخنی ہے جسے اس نے ایک سلنڈر میں محفوظ کیا تھا' لیکن ڈیڑھ صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود وہ ابھی تک محفوظ ہے اور خراب نہیں ہوئی کہ آج بھی اسے وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ پاسچر نے واضح طور پر یہ ثابت کر دکھایا کہ کوئی جرثومہ بے جان مادے سے پیدا نہیں ہو سکتا' خواہ یہ مادہ کھلی ہوا میں ہی کیوں نہ رکھا ہو۔ شرط یہ ہے کہ ہوا میں خاک کے ذرات نہ ہوں۔ پاسچر نے ثابت کیا کہ جراثیم اپنے تخم سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تخم وافر تعداد میں ہوا میں شامل خاک کے ذرات میں موجود ہوتے ہیں۔ پاسچر کے خیال کے مطابق زندگی ہمیشہ پہلے سے موجود زندگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح حیات از حیات (Biogenesis) کا نظریہ درست معلوم ہونے لگا۔

(۳) نزولِ جرثومۂ حیات (Cosmozoa)

لیکن از خود تولید کے نظریے سے بھی اس سوال کا تشفی بخش جواب مہیا نہ ہو سکا کہ زندگی پہلی بار کب' کہاں اور کیسے پیدا ہوئی؟

انیسویں صدی کے اواخر میں جب سائنس کی تازہ تحقیقات کی رُو سے یہ معلوم ہوا کہ زمین ہمیشہ سے زندگی کے لئے ایسی سازگار نہ تھی جیسی اب ہے' تو بعض علمائے سائنس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ غالباً زندگی کائنات کے کسی اور گوشے سے زمین پر آئی ہے۔ بعض ماہرین کہتے ہیں کہ زندگی کا جرثومہ کسی دوسرے سیارے سے نکلا' پھر ہزاروں سال تک فضا میں سرگرداں رہا اور ہماری زمین پر آن اُترا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زندگی ہماری زمین پر سنگِ شہابی وغیرہ کے ساتھ چلی آئی ہو۔ یہ نظریہ بھی قابل قبول نہیں' کیونکہ اوّل تو زندگی کے جرثومہ کے لئے ممکن نہیں کہ وہ فضائے مطلق کی ٹھنڈک

میں زندہ رہ سکے۔ اگر اس زبردست سردی میں اس کا زندہ رہنا مان بھی لیا جائے تو عالم بالا کی طاقتور شعاعیں جو بیرونی فضا میں بکھری ہوئی ہیں' اس کو ختم کرنے کے لئے کافی ہیں۔ فرض کرو اگر یہ نظریہ صحیح بھی ہو تو فقط اتنا معلوم ہو گا کہ ہماری زمین پر زندگی کا آغاز کیسے ہوا۔ یہ کیسے معلوم ہوا کہ زمین پر آنے سے پہلے زندگی کا اوّلین ظہور کب' کہاں اور کیسے ہوا؟ کائنات کے کسی اور گوشے یا سیارے میں زندگی کس طرح وجود میں آ گئی؟ جرثومۂ حیات کے نزول کا یہ نظریہ مسئلے کو سلجھانے کی بجائے ایک قدم پیچھے ہٹا دیتا ہے۔

(۴) نظریۂ پروٹو پلازم (Protoplasm Theory)

پروٹو پلازم' یا نخز مایہ یا مادۂ حیاتیہ کیا ہے؟ اس کی وضاحت گزشتہ شمارے میں ہو چکی ہے۔ اس نظریے کو آپ جدید سائنس کا نظریہ یا سائنس کا جدید ترین نظریہ کہہ سکتے ہیں۔ پروٹو پلازم کے انکشاف کے بعد اب زندگی کی اصلیت و ماہیت کو طبیعیات و کیمیا جیسے قدرتی اور قطعی سائنسی علوم کی روشنی میں بیان کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ پروٹو پلازم طبعی اور کیمیائی اعتبار سے نہایت پیچیدہ اور ہر دم متغیر شے ہے۔ اس نظریے کے مطابق زندگی ان انتہائی پیچیدہ اور نازک طبعی و کیمیائی تغیرات کا نتیجہ ہے جو پروٹو پلازم میں ہوتے رہتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ پروٹو پلازم کے مرکب کا ابھی تک مکمل اور تسلی بخش کیمیائی تجزیہ نہیں ہو سکا ہے' تاہم پروٹو پلازم کے متعلق اب تک جو کچھ دریافت ہو چکا ہے' اس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ زندگی کا طبعی و کیمیائی نظریہ قابل قبول ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ابھی انسان پروٹو پلازم بنانے پر قادر نہیں ہوا ہے' لیکن جس دن بھی اس کے تمام اجزائے ترکیبی دریافت ہو گئے اُسی دن انسان کے ہاتھوں مادۂ حیات کی تخلیق ممکن ہو جائے گی۔ طبیعیات' کیمیا اور اب فلکیات نے مل کر حیاتیات کے ساتھ ایسا گہرا تعاون کیا ہے کہ روزانہ نئے سے نئے انکشافات سامنے آ رہے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

مٹی سے پیدائش:

زندگی کا طبعی و کیمیائی نظریہ یوں تو حالیہ پچیس تیس برس کا قصہ معلوم ہوتا ہے' لیکن درحقیقت اس کی بنیاد ڈھائی ہزار سال پہلے پڑ گئی تھی۔ اس نظریے کے مطابق آج سے تقریباً چار ساڑھے چار ارب سال پہلے زمین کی پیدائش کے وقت یہاں کے حالات زندگی کی پیدائش' ظہور اور نشو ونما کے لئے سازگار نہ تھے۔ گویا سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے زندگی کو بے جان مادے یعنی مٹی سے پیدا کیا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مٹی سے زندگی کی پیدائش کا مرحلہ پہلے آیا' پانی سے پیدائش کا مرحلہ بعد میں آیا۔

۱۹۲۴ء میں ایک روسی بایوکیمسٹ الیگزنڈر اوپیرن نے زندگی کے آغاز کے بارے میں اپنا خیال پیش کیا۔ چند سال بعد اسی طرح کے نتائج ایک برطانوی سائنس دان جے بی ایس ہیلڈین نے بھی اپنے طور پر اخذ کئے اور شائع کرائے۔ ان دونوں کے مشترک نظریے نے حیاتیات کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ انہوں نے اپنے اپنے انداز میں ثابت کیا کہ سب سے پہلے کیمیائی ارتقاء ہوا۔ اربوں سال پہلے فضا اور سمندر میں جو عناصر تھے وہ آپس میں جذب ہوئے اور اس طرح سالمات بنتے گئے۔ یہ سالمات نہایت پیچیدہ ترکیب سے جمع ہوتے گئے' یہاں تک کہ وہ چیز وجود میں آ گئی جسے ہم ''اوّلین جاندار'' کہتے ہیں۔

کیمیائی ارتقاء کے بعد حیاتیاتی ارتقاء ہوا اور زندگی نے طرح طرح کے روپ دھارنا شروع کئے اور آج یہ بے شمار مختلف و متفرق و متنوع شکلوں میں ہمارے سامنے ہے۔ شروع میں سائنس دانوں نے اس نظریے کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی' تاہم ۱۹۵۳ء میں اسٹینلے مِلّر نے اپنے شاندار تجربے کے نتائج سے اس جھجک کو دور کر دیا۔ مِلّر کا تجربہ سمجھنے کے لئے زمین کی قدیم اور ابتدائی فضا کا تصور کیجئے۔ اس وقت زمین کی فضا میں آکسیجن' نائٹروجن اور کاربن ڈائی اکسائڈ نہ تھے' بلکہ آزاد ہائیڈروجن' میتھین' امونیا اور آبی بخارات کا دور دورہ تھا۔ اس وقت زمین کی فضا کی بالائی تہہ میں

اوزون کی عدم موجودگی کے باعث سورج کی تباہ کن اور بے حد توانائی والی بالا بنفشی شعاعیں زمین کو غسل دیتی رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ آتش فشانی عمل کی زیادتی نے بعض مقامات پر درجۂ حرارت کو ناقابل یقین حد تک بڑھا دیا تھا۔

مُلر نے لیبارٹری میں ایسے حالات پیدا کئے جو چار ساڑھے چار ارب سال پہلے زمین کی پیدائش کے وقت تھے۔ اس نے آبی بخارات' امونیا' میتھین اور ہائیڈروجن گیس کو ایک ہفتے تک اسپارک ڈسچارج سے گزارا اور نتیجے کے طور پر تقریباً دو درجن مختلف مرکبات حاصل کئے' جن میں یوریا' لیکٹک ایسڈ' چار مختلف امائنو ترشے اور زندگی کی بقا کے لئے اہمیت و افادیت رکھنے والے کئی دیگر مرکبات شامل تھے۔ بعد میں اپنے تجربے کو بعض تبدیلیوں کے ساتھ بار بار دہرایا گیا اور بے شمار ایسی چیزیں بنائیں جن کا زندگی سے بنیادی تعلق تھا۔ چنانچہ یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ زندگی کا آغاز بھی اسی طرح ہوا ہوگا۔

مٹی کی خاصیت:

لیکن یہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا بظاہر نظر آتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاید ایسا ہوا ہو' مگر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یقیناً اسی طرح ہوا تھا۔ چنانچہ اب ایک نیا مکتبِ فکر سامنے آ رہا ہے' جس کے خیال میں چار ساڑھے چار ارب سال پہلے زمین پر نہ تو کاربن ڈائی اکسائڈ کی کمی تھی اور نہ ہائیڈروجن اور میتھین کی کثرت۔ اس خیال کی بنیاد یہ ہے کہ زہرہ اور مریخ کی فضا میں کاربن ڈائی اکسائڈ کی کافی مقدار موجود ہے۔ گمان کیا جاتا ہے کہ زندگی کی پیدائش سمندر میں نہیں بلکہ مٹی میں ہوئی تھی' کیونکہ مٹی (Clay) میں توانائی کو محفوظ کرنے اور پھر منتقل کرنے کی اہم خاصیت کا پتا چلا ہے۔ اس سلسلے میں اپریل ۱۹۸۵ء میں سائنسی جریدے ''نیچر'' میں ایک خبر بھی شائع ہوئی تھی۔ مصنوعی سیاروں کی مدد سے کئی گنا زیادہ توانائی والی شعاعیں خارج ہوتی رہتی تھیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ زمین اگرچہ چار ساڑھے چار ارب سال پہلے تخلیق ہو چکی تھی' تاہم زندگی کے اوّلین آثار صرف تین ارب سال پرانے ہیں۔ یعنی زمین کی

پیدائش کے ارب ڈیڑھ ارب سال کے بعد زندگی کی پیدائش ہوئی۔

زمین پر زندگی کس طرح ممکن ہوئی؟ سچی بات یہ ہے کہ یہ سوال ابھی حل نہیں ہو سکا ہے' البتہ روز بروز ایسے نئے شواہد ملتے جا رہے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اس سلسلے میں دو چیزوں کو اساسی اہمیت حاصل ہے' یعنی مٹی اور پانی۔ اس سوال پر سائنس دانوں میں بے حد اختلاف پایا جاتا ہے کہ مختلف قسم کے سالمات کس طرح باہم ملے اور کیونکر وہ بڑا سالمہ پیدا ہوا جو قوتِ تولید رکھتا تھا۔ تاہم اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ کوئی شے ایسی ضرور تھی جس نے ان سالمات کو بار بار آپس میں ٹکرانے اور ایک دوسرے سے جڑتے چلے جانے میں مدد دی۔ اس سلسلے میں کیلی فورنیا کے ایمس ریسرچ سنٹر میں سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے چند دلچسپ تجربات کئے اور حیرت انگیز نتائج اخذ کئے۔ بنیادی خیال یہ تھا کہ وہ پانی' جس میں مختلف نامیاتی مرکب موجود تھے' بار بار ساحلی مٹی یا کیچڑ سے ٹکرایا اور مٹی یا گیلی مٹی میں جذب ہو گیا۔ اس طرح زندگی کے لئے لازمی مرکبات اور عناصر کو یکجا ہونے کا موقع ملا اور پھر وہ کیمیائی عمل ہوئے جن کی بدولت اوّلین جاندار' جو غالباً وائرس سے ملتا جلتا تھا' وجود میں آیا۔ سائنس دانوں کی مذکورہ ٹیم نے اسی مفروضے کو اساس بنا کر لیبارٹری میں قدیم ترین وقت کے بالکل ابتدائی حالات پیدا کئے اور مٹی میں مختلف نامیاتی مرکبات کو پانی کے ذریعے جذب کرایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں مٹی سے امائنو ترشے اور نیوکلیونائیڈز ملے۔ یہ دونوں مرکبات زندگی کی تمام صورتوں اور شکلوں کے لئے بنیادی اینٹ کی سی اہمیت رکھتے ہیں۔

یہ تجربہ مزید کامیاب ثابت ہوا جب ان علمائے فطرت نے چاند کی مٹی اور شہابیوں میں ملنے والی مٹی کی مدد سے زمانۂ قدیم کی مٹی کی کیمیائی ترکیب کا اندازہ لگایا۔ معلوم یہ ہوا کہ مٹی میں شامل بعض عناصر کیمیائی تعامل کو تیز تر کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر جس مٹی میں تانبا شامل تھا اس میں زیادہ اچھی طرح امائنو ترشے جمع ہوئے' لیکن یہ وہی اساسی ترشے تھے جو جانداروں میں ملتے تھے۔ یہ بات قریب قریب یقینی ہے کہ وہ مٹی سمندروں کے کنارے کنارے کثرت سے ملتی تھی جس میں نکل شامل تھا۔

یہ بھی دیکھا گیا کہ مختلف اقسام کے نیوکلیونائیڈز اس مٹی میں جمع ہوئے جس میں جست کی کچھ مقدار موجود تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جانداروں میں جو خامرہ (انزائم) نیوکلیونائیڈز کے سالمات کو جوڑ کر ڈی این اے کی شکل دیتا ہے' اس میں جست پائی جاتی ہے۔

ان نتائج سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے آغاز وظہور کے معمے کے ٹکڑے اپنی اپنی جگہوں پر فٹ ہوتے جا رہے ہیں اور ایک نہ ایک روز انسان اس معمے کو ضرور سمجھ لے گا' بشرطیکہ وہ وحیٔ الٰہی سے برابر روشنی اور ہدایت حاصل کرتا رہے کہ تخلیق کا راز اسی کے پاس ہے۔ اکثر آیاتِ قرآنی میں بار بار مٹی اور پانی کا نام تخلیق کے حوالے سے آتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

☆ ﴿اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ (آل عمران: ۵۹)

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک عیسیٰؑ کی مثال ہو بہو آدمؑ کی مثال ہے جسے مٹی سے بنا کر کہہ دیا کہ ہو جا' پس وہ ہو گیا''۔

☆ ﴿اَكَفَرْتَ بِالَّذِیْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا﴾ (الکہف: ۳۷)

''کیا تو کفر کرتا ہے اس ذات سے جس نے تجھے مٹی سے پیدا کیا؟ پھر نطفے سے' پھر تجھے ایک پورا آدمی بنا کر کھڑا کیا''۔

☆ ﴿فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ .....﴾ (الحج: ۵)

''سوچو! ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا' پھر نطفے سے' پھر خون کے لوتھڑے سے' پھر گوشت کی بوٹی سے''۔

☆ ﴿وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ﴾ (الروم: ۲۰)

''اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا' پھر اب انسان بن کر (چلتے پھرتے) پھیل رہے ہو''۔

☆ ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ .....﴾ (فاطر: ۱۱)

''لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہیں مٹی سے، پھر نطفے سے پیدا کیا''۔

ان آیات کا ایک ہی مفہوم ہے کہ تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو مٹی سے، پھر اس کے بعد تمہاری نسل کو قائم رکھنے کے لئے انسان کی تخلیق کو نطفے سے وابستہ کر دیا، جو مَرد کی پشت سے نکل کر عورت کے رحم میں آ جاتا ہے۔ سائنس کے نظریات بدلتے رہتے ہیں، جبکہ قرآنی آیات و احکام اٹل ہیں۔ جیسے جیسے انسانی علم ترقی کرتا جائے گا جوں جوں عقل کا دائرہ بڑھتا جائے گا اور قرآن مجید کے بیان کردہ حقائق ابنِ آدم کے سامنے واضح سے واضح تر ہوتے چلے جائیں گے۔

اب وہی سوال پھر ہمارے سامنے ہے جو محترم ساجد محمود مسلم نے ''حکمت قرآن'' کے شمارہ ستمبر ۲۰۰۳ء میں اور جناب اے ایچ کمالی نے شمارہ دسمبر ۲۰۰۳ء میں اٹھایا تھا، یعنی یہ کہ زندہ مخلوقات تبدیلی، تغیر اور ارتقاء کے کن کن مراحل سے گزرتی ہیں؟ اس پر اب تک حاصل شدہ سائنسی تحقیقات کے نتائج و مضمرات آئندہ شمارے میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

مصارفِ زکوٰۃ

اور

عصرِ حاضر (اکیسویں صدی عیسوی) میں
مصالحِ اُمّتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

کے عنوان سے

انجینئر مختار حسین فاروقی صاحب کا فکر انگیز مقالہ

آئندہ شمارے میں پیش کیا جا رہا ہے!

حضرت فضیل بن عیاضؒ

تحریر: عبدالرشید عراقی

حضرت فضیل بن عیاضؒ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اپنے علم و فضل، زہد و ورع، تقویٰ و طہارت، خشیت الٰہی اور انابت الی اللہ کی وجہ سے زمرۂ تابعین میں ممتاز مرتبہ و مقام کے حامل تھے۔ ان کو جو مرتبہ و مقام حاصل ہوا اس میں سرفہرست ان کا زہد و اتقاء تھا۔ ان کی پوری زندگی انابت الی اللہ کی صحیح تصویر تھی۔

فضیل بن عیاضؒ نے ایک مسلمان گھرانے میں جنم لیا۔ ابتداء میں ان کو سازگار ماحول میسر نہ آیا جس کی وجہ سے ان کی عادات بگڑ گئیں اور کچھ عرصہ بعد ایک رہزن اور ڈاکو کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ مؤرخین نے اس کی تصریح کی ہے کہ ان کی ڈاکہ زنی کا اتنا چرچا تھا کہ خراسان کے آس پاس سے قافلے گزرتے ہوئے خوف کھاتے تھے۔

توبہ

ان کی زندگی میں کس طرح انقلاب آیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو توبہ کی توفیق کس طرح دی کہ وہ ایک ڈاکو سے ولی کامل بن گئے، اس کے بارے میں ارباب سیر نے لکھا ہے کہ فضیل بن عیاض کو ایک لڑکی سے عشق ہو گیا تھا اور اس سے ملنے کی ہر وقت خواہش دل میں رہتی تھی اور پریشان بھی رہتے تھے، مگر خواہش نفس کی تکمیل کی کوئی سبیل پیدا نہیں ہو رہی تھی کہ ایک دن موقع پا کر لڑکی کے گھر کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہونا چاہتے تھے کہ پڑوس سے ایک آدمی کی زبان سے قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت ہوئی: ﴿اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (کیا ابھی اہل ایمان کے لئے وقت نہیں آیا ہے کہ ان کے دل اللہ کی یاد کے لئے جھک جائیں؟)'' فضیل قرآن

مجید کی یہ آیت سن کر لرز گئے اور بے اختیار پکار اٹھے:

''اے اللہ! وہ وقت آ گیا ہے کہ میں اپنے معاصی سے نکل کر تیرے دامنِ رحمت میں پناہ لوں''۔

چنانچہ اسی وقت واپس ہوئے۔ رات کا وقت تھا' اس لئے ایک جگہ رات گزارنے کے لئے ٹھہر گئے۔ قریب ہی ایک قافلہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ اہل قافلہ آپس میں مشورہ کر رہے تھے کہ کب رختِ سفر باندھا جائے۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ اس وقت سفر شروع کیا جائے اور کچھ لوگ اس پر بضد تھے کہ رات یہیں گزاری جائے اور صبح کے وقت سفر شروع کیا جائے' رات کا سفر اس لئے صحیح نہیں ہے کہ رات کو فضیل اسی راستہ پر ڈاکے ڈالتا ہے۔ فضیل نے قافلہ والوں کی یہ تمام باتیں سنیں اور بیان کرتے ہیں کہ میں نے دل میں سوچا کہ میں رات بھر معاصی میں غرق رہتا ہوں اور بندگانِ خدا مجھ سے ڈرتے ہیں۔ اُس وقت آپ نے صدقِ دل سے دعا کی:

اللّٰھم اِنّی تبتُ الیک وجعلتُ توبتی مجاورۃَ البیتِ الحرام

''اے اللہ! میں تیری طرف پلٹتا ہوں اور اس توبہ کے بعد اپنی زندگی تیرے محترم گھر کی خدمت کے لئے وقف کرتا ہوں''۔ (۱)

کوفہ روانگی

صبح ہوئی تو حضرت فضیل نے کوفہ کا رختِ سفر باندھا۔ کوفہ آ کر وہاں کے ائمہ حدیث وفقہ سے اکتسابِ فیض کیا۔ پھر حسب وعدہ مسجد الحرام کو اپنا مسکن بنایا اور اسی کے سایہ میں اپنی زندگی بسر کر دی۔ (۲)

اساتذہ وتلامذہ

حضرت فضیل بن عیاض نے جن نامور ائمہ حدیث وفقہ سے استفادہ کیا ان کے نام یہ ہیں:

امام اعمش' سلیمان التیمی' منصور بن معمر' حمید الطویل' یحییٰ بن سعید الانصاری' محمد بن اسحاق اور سفیان ثوری وغیرہم (۳)

تلامذہ میں سفیان بن عیینہ' عبداللہ بن مبارک اور امام احمد بن ادریس شافعی مشہور ہیں۔ (۴)

اعترافِ عظمت

حضرت فضیل بن عیاض کے علم وفضل' حفظ وضبط' عدالت وثقاہت' امانت و دیانت' ذکاوت وفطانت' تقویٰ وطہارت' زہدوورع اور خشیت الٰہی وانابت الی اللہ کا ارباب سیر اور ائمہ حدیث وفقہ نے اعتراف کیا ہے۔ محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ فضیل بن عیاض ثقہ وثابت تھے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ:

''فضیل بن عیاض کی توثیق پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے' وہ صحیح الحدیث اور صدوق اللسان تھے۔ ان کی روایات صحیح اور سچی ہوتی تھیں''۔ (۵)

زہدواتقاء ان کے صحیفۂ زندگی کا تابناک باب ہے۔ امام عبداللہ بن مبارک' جو خود زہدو اتقاء میں ضرب المثل تھے۔ ان کا بیان حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں درج کیا ہے کہ:

''فضیل بن عیاض اس زمانہ کے سب سے زیادہ متقی آدمی تھے اور میرے نزدیک زمین پر اِس وقت ان سے زیادہ افضل آدمی کوئی دوسرا نہیں ہے''۔ (۶)

خلیفہ ہارون الرشید عباسی کہا کرتے تھے:

''علمائے کرام میں امام مالک بن انس سے زیادہ بارعب اور فضیل بن عیاض سے زیادہ متقی اور صاحب ورع میں نے نہیں دیکھا''۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید نے جو کچھ کہا تھا وہ سنی سنائی بات نہیں تھی' بلکہ اس کا اپنا ذاتی تجربہ تھا۔

حافظ عبدالرحمٰن بن علی جوزی صفوۃ الصفوۃ میں لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ خلیفہ ہارون الرشید نے حج کے زمانہ میں منیٰ میں حضرت فضیل بن عیاض سے ملاقات کی اور ان سے کچھ نصیحتیں کرنے کی درخواست کی۔ حضرت فضیل بن عیاض نے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور رعایا پر ظلم وستم نہ کرنے کی تلقین کی۔ آخر میں ہارون الرشید نے آپ سے پوچھا: کیا

آپ پر کسی کا قرض تو نہیں ہے؟ فضیل بن عیاض نے فرمایا کہ ہاں میرے ربّ کا قرض میرے اوپر ہے جس کا وہ محاسبہ کرے گا۔ ہارون الرشید نے کہا کہ میں بندوں کے قرض کے بارے میں سوال کر رہا ہوں۔ حضرت فضیل نے جواب دیا: میرے اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم مجھے نہیں دیا۔ میرے اللہ نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں تنہا اس کو معبود سمجھوں اور اسی کی اطاعت کروں۔ پھر قرآن مجید کی یہ آیات پڑھیں:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۞ مَا اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِنْ رِّزْقٍ وَّمَا اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۞ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۞﴾ (الذاریات: ۵۶ تا ۵۸)

''میں نے جنات اور انسانوں کو محض اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں۔ نہ میں ان سے روزی چاہتا ہوں' نہ میری یہ چاہت ہے کہ یہ مجھے کھلائیں۔ اللہ تعالیٰ تو خود ہی سب کا روزی رساں' توانائی والا اور زور آور ہے۔''

ہارون الرشید نے ایک ہزار دینار پیش کئے اور کہا ان کو قبول کیجئے اور اپنے اہل وعیال کے مصرف میں لائیے۔ فضیل بن عیاض نے فرمایا: سبحان اللہ! میں آپ کو نجات کا راستہ بتاتا ہوں اور آپ اس شکل میں بدلہ دینے کی کوشش کرتے ہیں! اس کے بعد خاموش ہو گئے۔

مجلس برخاست ہوئی تو ہارون الرشید اپنے مصاحبوں کے ساتھ واپس آ گیا اور مصاحبوں سے مخاطب ہو کر کہا: ''فضیل بن عیاض واقعتہً سید المسلمین ہیں''۔

ذکر الٰہی اور قرآن مجید سے شغف

حضرت فضیل بن عیاض کو قرآن مجید سے بہت زیادہ شغف تھا' اس لئے کہ قرآن مجید کی ایک آیت نے ان کی کایا پلٹ دی اور وہ ایک رہزن سے ولی کامل بن گئے۔ آپ قرآن مجید کی بہت زیادہ تلاوت فرماتے اور اس میں غور وفکر کرتے تھے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

''جب قرآن مجید کی آیات سنتے تو اُن پر خوف وغم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی

اور ان کی آنکھیں اس طرح آنسو بہاتی تھیں کہ دیکھنے والوں کو اُن پر رحم آتا تھا''۔(۷)

حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ ایک بار امام احمد بن حنبل حضرت فضیل بن عیاض کی ملاقات کے لئے ان کے مکان پر تشریف لے گئے اور ان سے ملاقات کی اجازت چاہی' لیکن آپ نے اجازت نہ دی۔ امام احمد بن حنبل کے ساتھ اور آدمی بھی تھے۔ ان میں سے ایک آدمی نے کہا اگر حضرت فضیل بن عیاض قرآن مجید کی آواز سن لیں تو مکان سے باہر آ جائیں گے۔ چنانچہ ایک آدمی نے بلند آواز سے سورۃ التکاثر کی تلاوت شروع کر دی۔ حضرت فضیل نے جب قرآن مجید پڑھنے کی آواز سنی تو فوراً مکان سے باہر تشریف لے آئے۔ اس وقت ان کا یہ حال تھا کہ زار و قطار رو رہے تھے اور داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔(۸)

وفات

محرم ۱۸۷ھ میں انتقال کیا۔ عمر ۸۰ سال سے متجاوز تھی۔(۹)

زریں اقوال

حضرت فضیل بن عیاضؒ کے اقوال حافظ ابن کثیر نے ''البدایہ والنہایہ'' میں اور علامہ ابن خلکان نے اپنی تاریخ میں درج کئے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

''دوسروں کے دکھاوے کے لئے کوئی عمل کرنا شرک ہے اور دوسروں کی وجہ سے کوئی عمل چھوڑ دینا ریا ہے' اور اخلاص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دونوں سے محفوظ رکھے''۔

حواشی

۱) تہذیب التہذیب' ج ۸' ص ۲۹۵
۲) تاریخ ابن خلکان' ج ۲' ص ۱۵۸
۳) البدایہ والنہایۃ' ج ۱۰' ص ۱۹۸
۴) تہذیب الاسماء' نووی' ج ۲' ص ۵۱
۵) تہذیب الاسماء' نووی' ج ۲' ص ۵۱
۶) تہذیب التہذیب' ج ۸' ص ۲۹۵
۷) تہذیب التہذیب' ج ۸' ص ۲۹۵
۸) صفوۃ الصفوہ' ج ۲' ص ۱۳۵
۹) تبع تابعین' ج ۱' ص ۴۰۳

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : اسلامی حکومت کا فلاحی تصور

مصنف : مولانا سعید الرحمٰن علوی

ضخامت: 180 صفحات ..... قیمت :120 روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جمال، حسن مارکیٹ، اردو بازار لاہور

مولانا سعید الرحمٰن علوی ایک معروف دینی وعلمی شخصیت تھے۔ آپ نے صرف چھیالیس سال کی عمر پائی۔ اس مختصر سی زندگی میں تعلیم بھی حاصل کی، تحقیق ومطالعہ بھی کیا درجن بھر کتابیں بھی لکھیں۔ اس کے علاوہ ایک طویل عرصے تک معروف دینی رسالے خدام الدین کی ادارت بھی کرتے رہے اور بعد ازاں کئی برس تک مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے شعبہ مطبوعات سے وابستہ رہنے کے ساتھ ساتھ قرآن اکیڈمی میں تدریس کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے۔ زیر نظر علمی موضوعات پر آپ کے مضامین معیاری رسائل وجرائد میں جگہ پاتے رہے۔ مرحوم نے اپنے ماہ وسال سے اس تیز رفتاری سے فائدہ اٹھایا کہ اگر مہلت عمر وفا کرتی تو تبلیغ واشاعت اسلام کے سلسلہ میں گراں قدر اور وسیع ذخیرہ چھوڑ جاتے۔ مولانا سعید الرحمٰن علوی کی خواہش تھی کہ ان کے مضامین کتابی صورت میں شائع ہوں، مگر عمر نے مہلت نہ دی اور یہ کام ان کی زندگی میں نہ ہوسکا۔ اب ان کے برادر عزیز مولانا عزیز الرحمٰن خورشید نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور یہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کاوش ہے جس میں تین مضامین یکجا کر کے شائع کر دیئے گئے ہیں:

۱) اسلامی حکومت کا فلاحی تصور ۲) اقتصادی مسئلہ کا حل قرآن وسنت اور فقہ کی رو سے
۳) الحجر۔ حجر کی لغوی، شرعی تحقیق

تینوں مضامین انتہائی جامع، مدلل اور بلند علمی تحقیق کا مظہر ہیں۔ کتاب کا پیش لفظ

معروف عالم دین' خانقاہ سراجیہ کے مہتمم مولانا خان محمد مدظلہ نے لکھا ہے جو کتاب کے مندرجات کی ثقاہت کا واضح ثبوت ہے۔ اہل علم وعرفان اور جویانِ حق اس کتاب کو مفید مطلب پائیں گے۔ مکتبہ جمال کے منتظمین بھی اس کتاب کی اشاعت پر بجاطور پر تحسین و آفرین کے مستحق ہیں۔ کتاب سفید کاغذ پر خوبصورت انداز میں شائع کی گئی ہے۔ جلد مضبوط اور ٹائٹل خوشنما ہے۔

(۲)

نام کتاب : ارکانِ اسلام

مصنف : مولانا ابوالکلام آزاد

مرتب : میاں مختار احمد کھٹانہ

ضخامت:392 صفحات ..... قیمت :160 روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جمال' تیسری چھت' حسن مارکیٹ' اردو بازار لاہور

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ برصغیر کے نامور عالم دین' بلند پایہ ادیب' اونچے درجے کے خطیب اور عبقری انسان تھے۔ آپ جیسی منفرد خوبیوں کے مالک انسان بہت کم پائے جاتے ہیں۔ آپ کو بجاطور پر ابوالکلام کہا جاتا ہے۔ متحدہ برصغیر میں آپ نے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' جاری کئے۔ اگرچہ ان جرائد کی عمر سوا تین سال سے زیادہ نہ تھی مگر یہ شہرت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے۔ آج بھی ان رسائل کی فائلیں بڑی عقیدت کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ آپ قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی پر گہری نظر رکھتے تھے۔ آپ نے اسلامی تعلیمات پر مشتمل بہت سا لٹریچر چھوڑا جو آج بھی نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

آپ جو لکھتے پورے اعتماد سے لکھتے اور جو کہتے پوری ذمہ داری سے کہتے۔ چنانچہ انہوں نے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر قلمبند کی تو اسے وہ قبولِ عام ملا کہ شاید وباید۔ زیرتبصرہ کتاب میں مولانا کی مختلف تحریروں سے توحید' نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ کے متعلق مواد یک جا کر دیا گیا ہے۔ ارکانِ اسلام کی حقیقت جاننے کے لئے یہ کتاب نہایت موزوں ہے۔ مولانا کی بدیع الاسلوب تحریریں اور ایمان افروز تقریریں حددرجہ مؤثر اور دلنشیں ہوتی ہیں۔

اس کتاب میں عقیدۂ توحید کا ذکر ایک سو سے زائد صفحات پر محیط ہے' جس میں اس مسئلے

کے علمی، عملی، عقلی اور فلسفیانہ ہر پہلو پر سیر حاصل اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ربوبیت کی صفت پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر ایک شخص بھوکے کو کھانا کھلا دے یا محتاج کو روپیہ دے دے تو یہ اس کا کرم ہوگا' جود ہوگا' احسان ہوگا' لیکن وہ بات نہ ہوگی جسے ربوبیّت کہتے ہیں۔ ربوبیّت کے لئے ضروری ہے کہ پرورش اور نگہداشت کا ایک جاری اور مسلسل اہتمام ہو اور ایک وجود کو اس کی تکمیل و بلوغ کے لئے وقتاً فوقتاً جیسی کچھ ضرورتیں پیش آتی رہیں' ان سب کا سروسامان ہوتا رہے۔ نیز ضروری ہے کہ یہ سب کچھ محبت وشفقت کے ساتھ ہو' کیونکہ جو عمل محبت وشفقت کے عاطفہ سے خالی ہوگا ربوبیّت نہیں ہوسکتا۔''

دیکھا آپ نے تفہیم کا انداز! اس سے زیادہ تاثیر کہاں سے آئے گی۔

حقیقت نماز کے سلسلہ میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''غور کرو! جو نماز تم پڑھتے ہو' جس عبادت پر تمہیں ناز ہے اور جو انداز پرستش تم نے قائم کر رکھا ہے' وہ حقیقت سے کس قدر دور ہے؟ کیا اس نے کبھی تمہیں فواحش ومنکرات سے روکا؟ کیا اس کے ذریعے تمہارا کردار پاک وبلند ہوسکا؟ کیا اس کی مواظبت نے تم میں کوئی روحانیت پیدا کی؟ کیا تمہاری تنزل پذیر حالت اس کے طفیل ذرا سی بدلی؟ کیا خدا کا تعلق اور مخلوق کا رشتہ تمہارے ہاتھ آسکا۔ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر کیا یہ وہی نماز ہے جس کی نسبت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بے خودانہ لہجے میں فرمایا تھا: ''لَا حَظَّ فِی الْحَیَاۃِ وَقَدْ عَجُزْتُ عَنْ اِقَامَۃِ الصَّلَاۃِ''۔ (ادائے نماز ہی کی استطاعت نہ رہی تو پھر زندگی میں کیا لطف رہا؟)''

الغرض ارکانِ اسلام کی حقیقت جاننے کے لئے اس کتاب کی اہمیت مسلّم ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد برصغیر میں ایک ممتاز سیاست دان کی حیثیت سے بھی ابھرے۔ اُن کے سیاسی نظریات کے ساتھ لوگوں کو شدید اختلاف ہوا' مگر ان کا علمی اور ادبی پایہ بحالہ بلند رہا اور آج بھی بلند ہے۔

کتاب ارکان اسلام کی تفہیم پر اعلیٰ درجہ کی تصنیف ہے۔ نہ صرف عام لوگوں بلکہ علماء و خطباء کے پڑھنے کی چیز ہے۔ کتاب کا ٹائٹل خوبصورت اور جلد مضبوط ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف

جسے بجا طور پر سلسلہ اقبالیات میں ''بقامت کہتر و لے بقیمت بہتر''
کی مصداق کامل قرار دیا جا سکتا ہے

علامہ اقبال اور ہم

مع

فکر اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کا جائزہ
اور ہماری قومی ذمہ داریاں

☆☆☆

❁ حیات و سیرتِ اقبال ❁ فلسفہ اقبال
❁ ملت اسلامیہ کے نام علامہ اقبال کا پیغام

از قلم : پروفیسر یوسف سلیم چشتی

☆☆☆

❁ اقبال اور قرآن ، از قلم: سید نذیر نیازی

قارئین کی سہولت کے لئے فارسی اشعار کا اردو ترجمہ بھی شامل کتاب کیا گیا ہے

قیمت: اشاعت خاص (سفید کاغذ، پائیدار و خوبصورت جلد) 72 روپے
اشاعت عام: (نیوز پیپر ایڈیشن) 30 روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 03-5869501، فیکس: 5834000